urdunovelist.blogspot.com

انوار علیگی کے افسانے

پوری عورت

urdunovelist.blogspot.com

انوار علیگی

اسٹاکسٹ:۔
مکتبہ القریش © سرکلر روڈ
اردو بازار، لاہور۲۔ فون:7668958
E.mall: al_quralsh@hotmall.com

معیاری اور خوبصورت کتابیں

بااہتمام..... محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

باراول ——— جنوری 2005ء

مطبع ——— نیر اسد پریس

سرورق ——— انعام راجہ

کمپوزنگ ——— وسیم احمد قریشی

قیمت ——— -/150 روپے

urdunovelist.blogspot.com

اِنتساب

اچھی طرح جان لو، سمجھ لو کہ
اللہ کائنات کا مالک ہے۔ کائنات کا خالق ہے۔
رحمٰن ہے۔ رحیم ہے۔ قادرِ مطلق ہے۔
ذرّے ذرّے پر اُس کا حکم رانی ہے۔
ہوتا وہ ہے جو وہ چاہتا ہے۔
اگر ہم اللہ کے ہو جائیں اور وہ چاہیں۔
جو وہ چاہتا ہے تو پھر اللہ وہ چاہے گا جو ہم چاہتے ہیں
اگر ہم نے وہ چاہا جو ہم چاہتے ہیں تو
اللہ ہمیں اپنی چاہت میں خوار کر دے گا۔
اور ہوگا وہ جو وہ چاہے گا۔
اچھی طرح جان لو، سمجھ لو کہ
ہوتا وہی ہے جو کائنات کا مالک چاہتا ہے۔

فہرست

دردکا دریا	7
شاطر	17
ہم اور وہ	24
دھوکے باز لفظ	29
پھڑ پھڑاتے پَر	34
شوقِ دید	41
سات تالے	52
سیاست	62
کہانیوں کا شہر	73
پپڑی جمے ہونٹ	84
بے نشاں منزلیں	92
تسکین	96
ٹوٹا ہوا آدمی	107
پاگل اور یادیں	114
گرفت	123
ناممکن	138
آدھا مکان	146
کچھ ہے	165
ٹرین	180
شیر خوار	195
ڈھکوسلہ	201
پوری عورت	207

urdunovelist.blogspot.com

دل کی بات

یہ میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ ہوسکتا ہے آخری ہو۔

روایت یہ ہے کہ جب کوئی افسانہ نگار اپنی تخلیق منظر عام پر لاتا ہے تو اپنے بڑوں سے اس پر کچھ لکھواتا ہے۔ یہ رائے سو فیصد تعریفی ہوتی ہے اور اس جبری تعریف میں بڑی حد تک غلو شامل ہوتا ہے۔ کبھی صاحب کتاب میں کوئی منٹو کو ڈھونڈتا ہے تو کبھی راجندر سنگھ بیدی کو اور کبھی کرشن چندر کو تلاش کیا جاتا ہے۔ جب یہ کتاب قاری کے ہاتھ میں آتی ہے تو ان آراء پر نظر ڈالنے کے بعد وہ دیر تک مسکراتا رہتا ہے۔

اس کتاب پر آپ کو کوئی فلیپ، کوئی پیش لفظ نظر نہیں آئے گا۔ میں کیونکہ روایتی آدمی نہیں ہوں اس لئے ان تعریفی آراء سے اجتناب برتا ہے۔ جادو، وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ تخلیق وہ جو ریت پر لکیر ثابت نہ ہو۔ اچھی تخلیق وہی ہوتی ہے جو زندہ رہے جسے وقت کی گرد نہ مٹا سکے۔ اچھی تخلیق کو ناپنے کا بہترین پیمانہ وقت ہے جو تخلیق وقت کی مار سہہ لے پھر اُسے مارنے والا کوئی نہیں۔

مجھے راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور ڈاکٹر قاضی عبدالستار کو روبرو افسانے سنانے کا اعزاز حاصل ہے۔ میں نے پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر احسن فاروقی سے اپنے افسانوں پر داد پائی ہے اور بھی کئی بڑے نام ہیں جنہوں نے مجھے قابل اعتنا سمجھا۔ میرے افسانے پڑھے اور تعریف کی۔ ویسے لکھنے والے کا اصل سرمایہ قاری ہوتا ہے جس نے لکھنے والوں کا اعتماد حاصل کرلیا، سمجھو اُس نے اپنے ہونے کا عرفان حاصل کرلیا۔ ہر تخلیق نظر کی محتاج ہوتی ہے۔ تخلیق اگر پردے میں رہے تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ خالق کائنات نے کائنات تخلیق کرنے کے ساتھ دیکھنے والا بھی بنایا تاکہ دیکھنے والا دیکھے اور اس کی تعریف کرے۔ جس طرح کائنات کا مالک چاہتا ہے کہ انسان اس کی تعریف کرے تو انسان کیسے نہ چاہے گا کہ وہ کوئی چیز تخلیق کرے اور اسے کوئی نہ دیکھے، تعریف نہ کرے۔ دراصل ایک ستائشی نظر ہی تخلیق کار کا انعام ہوتی ہے۔ بشرطیکہ ستائش سچی ہو۔

1960ء میں میرا پہلا افسانہ چھپا، 1969ء میں، میں علیگڑھ سے لاہور منتقل ہوا، 1984ء تک افسانہ نگاری کا سلسلہ چلا۔ اس طرح اس مجموعے میں شامل افسانے کچھ انڈیا میں اور کچھ پاکستان میں لکھے گئے۔ ان میں ایک افسانہ ''کچھ ہے'' آدھا انڈیا اور آدھا پاکستان میں تخلیق ہوا۔ یہ افسانے چوبیس سال پر محیط ہیں۔ پھر میری توجہ ناول نگاری کی طرف مبذول ہوگئی۔ اب تک میرے چھ ناول سفید محل، خالی گھر، بچھو، ہوشربا، ریچھ کے اسرار اور ہزار داستان منظر عام پر آچکے ہیں۔ میں بنیادی طور پر افسانہ نگار ہوں۔ افسانہ لکھنے کیلئے آج بھی دل تڑپتا ہے۔ ممکن ہے آئندہ میں افسانہ نگاری کی طرف لوٹ آؤں۔ پھر یہ مجموعہ آخری نہ رہے گا۔

انوار علیگی

درد کا دریا

صبح ہوئی، سورج نکلا۔ اور سورج نکلتے نکلتے یہ بات سارے محلے میں اُڑ گئی کہ ماسٹر مراد کی لونڈیا اپنے یار کے ساتھ بھاگ گئی۔ اس خبر کو ایک گھر سے دوسرے گھر تک پہنچانے والی ایک بھنگن تھی۔ کٹوری۔ وہ جوان تھی۔ لہنگے پر چھوٹی سی کرتی پہنتی تو غضب ڈھاتی۔ چلتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے طبلے کی تھاپ پر ٹھمک رہی ہو۔ رنگ سیاہ تھا۔ چہرے کے نقوش تیکھے تھے لیکن ایک آنکھ میں جالا تھا۔ اس جالی دار آنکھ سے اُسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا مگر دوسری آنکھ اُس کی بہت تیز تھی۔

وہ صبح ہوتے ہی جھاڑو پنجہ لے کر آجاتی اور کمانا شروع کردیتی۔ کمانے کی ابتداء وہ ماسٹر مراد کے یہاں سے ہی کرتی تھی۔ کیونکہ گلی کے نکڑ پر ہی اُس کا گھر تھا اور وہیں سے اُس کی ''بستی'' شروع ہوتی تھی۔

ماسٹر مراد کے گھر میں داخل ہوتے ہی کٹوری کی نظر سب سے پہلے ماسٹرنی پر گئی جو سسکیاں بھر رہی تھیں۔ اور بوڑھے مراد جھنگو لا چارپائی پر، ہاتھ میں منہ دیئے بیٹھے تھے۔ آدھے درجن بچے سہمے سہمے سے اُن کو دیکھ رہے تھے۔ سب سے چھوٹا بچہ جو ننگا تھا اپنی ماں کا ساتھ دے رہا تھا۔ صحن میں برتن اوندھے سیدھے پڑے تھے۔

آہٹ سن کر ماسٹر مراد نے ہاتھوں سے چہرا اُٹھایا دھندلے دھندلے شیشوں والی عینک سے کٹوری

urduhovelist.blogspot.com

کو دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ ماسٹرنی بدستور روتی رہیں انہیں کٹوری کے آنے کی مطلق خبر نہ ہوئی۔

کٹوری نے کچھ سیکنڈ کھڑے ہو کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ معاملہ کیا ہے؟ جب ناکام رہی تو اُس کی تجسس کی آگ بھڑکی اور وہ گھبرائے لہجے میں بولی۔ ''بی بی جی..... کا ہوا..... یہ رونا دھونا کیسا؟''

اچانک سسکیاں بند ہوگئیں۔ انہوں نے اپنے میلے اور پھٹے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے کٹوری کی طرف دیکھا۔

کٹوری نے آنکھیں اور بھنویں ہلائیں۔ وہ جواب سننے کے لئے بے قرار تھی لیکن جواب نہیں ملا۔ ماسٹرنی سسکتی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئیں۔ ماسٹر مراد نے اُنہیں جاتے دیکھا اور پھر کٹوری کی طرف گردن گھمائی۔

''کا ہوا..... بابو جی۔''

''کچھ نہیں..... جاؤ تم اپنا کام کرو۔'' ماسٹر مراد نے نرمی سے کہا۔

اُس نے چپ چاپ کمایا اور باہر نکل گئی۔ مگر ایک سوال نے اس کی کھوپڑی پر ہتھوڑا بجانا شروع کر دیا کہ ماجدہ کہاں گئی؟

وہ روز اسے برتن مانجھتی ہوئی ملتی تھی۔ آج اُس کا پتہ نہ تھا۔ کمرے میں بھی نہ تھی۔ پڑوسن کے مکان میں پہنچ کر اس نے اپنے شبہ کی تصدیق کی اور بہت جلد اُس نے فیصلہ کر لیا۔ اب وہ جس مکان میں داخل ہو رہی تھی۔ اپنے بھرے بھرے کولہے سے نوکری اُتار کر یہ خبر سنا رہی تھی۔

''اے بی بی جی..... تم نے سنا..... وہ ماسٹر مراد کی لونڈیا بھاگ گئی۔''

''چل ہٹ ری۔''

''سچ بی بی جی..... رات کو بھاگ گئی۔ کنجڑے رشید کے لونڈے کے ساتھ۔ سنا ہے بہت دن سے اُن کا عشک چل رہا تھا۔ وہ چھپ چھپ کر ملتے تھے بی بی جی۔''

''اری ہم تو پہلے ہی سمجھتے تھے کہ اُس کے لچھن ٹھیک نہیں۔ یہ ضرور ایک دن گل کھلائے گی۔ لو آج سن لیا کہ حرامزادی بھاگ گئی۔ ماں باپ کی عزت میں آگ لگا دی، ماں باپ ہی اندھے تھے جو سانڈنی کو کھلے بندوں چھوڑ دیا۔ ارے ہماری بھی تو لونڈیاں ہیں۔ مجال ہے جو میری اجازت

کے بغیر ادھر سے ادھر ہو جائیں۔ تو ہی بتا کٹوری تو نے میری نصیبن اور حمیدن کو کبھی دروازے پر کھڑا دیکھا ہے۔''

''نا بی بی جی..... کبھی نہیں۔'' کٹوری نے سفید جھوٹ بولا۔

''پر ایک بات ہے کٹوری۔''

''وہ کا بی بی جی۔''

''کم بختوں کو کھانے کو ٹکڑے میسر نہیں مگر وہ کیسی سانڈنی ہو رہی تھی۔ ایک ہماری لونڈیاں ہیں۔ اتنا تھورتی ہیں مگر پھر ویسی کی ویسی، پیلی سی، جیسے تپ دق ہوگئی ہو کم نصیبوں کو۔''

ماجدہ کو پورا محلہ سانڈنی ہی کہتا تھا اگرچہ وہ زیادہ موٹی تو نہ تھی مگر اس کے جسم کا ہر بند اور ہر جوڑ کسا ہوا تھا۔ کھانے کو سوکھی روٹی اور چٹنی اور کبھی کبھی فاقوں کے سوا کچھ نہ ملتا تھا مگر پھر بھی اس کی صحت محلے کی لڑکیوں کے لئے قابل رشک تھی۔ بوڑھیاں اُسے دیکھ لیتیں تو اُن کا پارہ ایک دم چڑھ جاتا۔ ''اس پر چڑھی ہے جوانی تو۔''

''حرام زادی کا سینہ تو گھنٹہ گھر سے بھی اونچا ہے۔''

''شریف لڑکیوں کی طرح نچلا تو بیٹھا ہی نہیں جاتا کمبخت سے۔ ناچتی پھرتی ہے چاروں طرف۔''

''بات کرنے کا انداز تو دیکھو رنڈی معلوم ہوتی ہے رنڈی کیسی اترا اترا کر بول رہی ہے۔ کبھی ہاتھ نچاتی ہے تو کبھی بھنویں چڑھاتی ہے۔ کبھی کولہے مٹکاتی ہے۔''

''اری اس کے ماں باپ کیسے ہیں جو بے نکیل چھوڑ رکھا ہے اس کو ناتھ کر کیوں نہیں رکھتے۔''

ماجدہ کے کانوں میں ان جملوں کی بھنک پڑ جاتی تو وہ خاموش رہتی۔ ان زہر آلود تیروں کو برداشت کر جاتی۔ کبھی کبھی سوچتی کہ آخر یہ بوڑھیاں میرے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑی ہیں۔ مجھ میں ایسی کیا خرابی ہے۔ یہی کہ میرا جسم گدرایا ہوا ہے۔ میں ہر ایک سے ہنس بول کر بات کرتی ہوں۔ گھر گھر گھومتی ہوں..... کیا ان بوڑھیوں نے ایسا نہیں کیا۔ کیا یہ کبھی جوان نہ تھیں کیا ان کا دل خواہ مخواہ ہنس بول کر بات کرنے کو نہ چاہتا تھا۔ اگر میری صحت اچھی ہے تو اس میں میرا کیا قصور۔ کسی سے مانگنے تو نہیں جاتی۔

وہ سوچتی رہتی اور سوچ سوچ کر کڑھتی رہتی۔ مگر بظاہر وہ ان جملوں کا اثر نہ لیتی بلکہ پہلے سے

urdunovelist.blogspot.com

بھی زیادہ شوخ و شنگ اور بے باک نظر آتی۔

ماسٹر مراد کی سب سے بڑی لڑکی یہی ماجدہ تھی۔ اس کے علاوہ چھ بچے اور تھے۔ تین لڑکے اور تین لڑکیاں۔ ان سب کی پیٹ کی آگ بجھانے والا تنہا ایک آدمی تھا۔ ماسٹر مراد میونسپل بورڈ کے اسکول نمبر 19 میں ٹیچر تھے۔ تنخواہ نہ ملنے کے برابر ملتی تھی۔ صرف پینتالیس روپے۔

پینتالیس روپے..... ایک ہرا اور چار نیلے نوٹ۔ جب ان کے ہاتھ میں آتے تو تھوڑی دیر کے لئے خوشی کا ٹھکانہ نہ رہتا وہ انہیں کبھی مٹھی میں دباتے، کبھی ان کو بجا کر، کڑکڑ کی آواز سے محظوظ ہوتے۔ لیکن ایک منٹ کے لئے۔

اس گرانی کے دور میں ان روپوں کی حیثیت ہی کیا تھی۔ اتنے روپوں میں تو ایک من گیہوں بھی نہیں آتا۔ پتہ نہیں یہ مہنگائی کیا ستم ڈھائے گی۔ آج ہر چھوٹی بڑی چیز کو آگ لگی ہے۔ اس آگ کو بجھانے کے لئے ڈھیر سارے روپوں کی ضرورت ہے۔ اور اتفاق سے غریبوں کے پاس اس کی کمی ہے۔

ساٹھ روپے تو کلو پنساری کے دینے ہیں۔ دو مہینے سے نہیں دیئے۔ جب آیا تو بہانہ کر دیا مگر اب وہ نہیں مانے گا۔ اس کو کچھ دینا ہی پڑے گا۔ ورنہ وہ سودا دینا بند کر دے گا۔ تیس روپے اُسے دے کر خوشامد کر لوں گا۔ مان جائے گا شریف آدمی ہے۔

بیس روپے لکڑی والے کے ہیں وہ پرسوں ہی گھر آیا تھا۔ کتنی گالیاں دے کر گیا تھا۔ جیسے تیسے باپ بھائی کہہ کر اُسے ٹالا کہ پہلی تاریخ کو ضرور اُس کے پیسے پہنچ جائیں گے۔ اب اگر اُس کے روپے نہ گئے تو وہ جان کو آجائے گا۔ ہوسکتا ہے مار پیٹ بھی کرے۔ جاہل ہے اُس سے کچھ بعید نہیں۔ اُس کا حساب چکا دینا ہی اچھا ہے۔ مگر پانچ روپے کہاں سے آئیں گے۔ اتنی سلائی کب آتی ہے۔ ارے ہاں مشین کی قسط بھی تو ادا کرنی ہے دس روپے یہ تو بہت ضروری ہیں۔ اگر نہیں گئے تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ خواہ مخواہ مشین ہاتھ سے جائے گی۔ آٹھ دس آنے تو دے ہی دیتی ہے۔ تو پھر کیا کیا جائے۔ دس روپے اگر قسط کے دیئے تو ٹال والے کو کیا دیں۔ پانچ روپے میں وہ کمبخت کبھی نہ مانے گا۔ اور اگر کلو کو تیس کے بجائے بیس دیئے جائیں تو بھی کام نہیں چلتا۔ کیونکہ چھ روپے بھنگن کو دینے ہیں۔ تین مہینے سے نہیں دیئے ہیں۔ وہ روز کمانا چھوڑنے کی دھمکی دیتی ہے۔

پانچ روپے دھوبی کے ہیں۔ بہشتی کے الگ ہیں۔ وہ کمبخت بھی کن من کر رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا کس کو دوں اور کس کے روک لوں۔ کوئی بھی تو ایسا نہیں جو مان جائے۔ سب کپڑے پھاڑنے کو تیار ہیں۔ ارے ہاں یاد آیا۔ پندرہ روپے کپڑے والے کے بھی تو ہیں اور سو روپے مکان کا کرایہ، دس مہینے سے نہیں دیا۔

جوں جوں وہ سوچ رہے تھے ایک نیا قرض سپاہی بن کر ہاتھ میں ہتھکڑی لے کر سامنے آرہا تھا۔ وہ فیصلہ نہ کر پائے کہ تبرک جیسے روپوں کو وہ کس کو دیں اور کس کو نہ دیں۔

تھکے ہارے نڈھال نڈھال گھر پہنچے۔ چودہ آنے گز کی ملیشیا کی قمیص کی جیب میں پینتالیس روپے پڑے سینے کو گرما رہے تھے۔ ماجدہ رنگین چارخانے کا تہبند باندھے، بیٹھی، شلوار دھو رہی تھی۔ تہبند کے پھٹے حصوں پر اُس کے کولہے اور ران کی جلد کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ جمپر کو اُس نے پیچھے سے سمیٹ کر گود میں ڈال لیا تھا تاکہ نیچے بہتے ہوئے پانی میں بھیگنے پائے۔ اُس کے کولہوں کے نشیب و فراز جمپر نہ ہونے کی وجہ سے نمایاں تھے۔

صحن میں چھوٹی بچی کھڑی رو رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک ٹوٹا سا پیالہ تھا۔ جس میں کھچڑی کے دانے چمٹے ہوئے تھے۔ برابر ہی ایک بغیر ادوان کی چارپائی پڑی تھی۔ وہ اُسی میں بیٹھ کر جھولنے لگے۔

''بیٹی..... یہ رات میں کیوں کپڑے دھونے بیٹھی ہے؟''

''ابا جان..... وہ صابن نہیں تھا نا..... پیسے بھی نہیں تھے ابھی تھوڑی دیر پہلے چھ آنے سلائی کے آئے تو میں نے امی سے کہہ کر دو آنے کا صابن منگوالیا۔ رات بھر میں یہ سوکھ جائے گی۔ میرے پاس ایک دُھلا دُھلایا جمپر رکھا ہے۔ اُس کے ساتھ صبح کو پہن لوں گی۔''

''ٹھیک ہے بیٹی مگر تہبند تو مجھے چاہئے گا رات کو۔''

''آپ امی جان کا دوپٹہ باندھ لیجئے ابا جان۔''

''کہاں ہے تیری امی۔''

اسی وقت ماسٹرنی کمر بند اُڑستی ہوئی غسل خانے سے باہر نکلیں اور بولیں۔

''کیوں جی آگئے..... لو منہ ہاتھ دھولو۔'' انہوں نے فوراً ہی لوٹے میں پانی بھر کر موری پر

urdunovelist.blogspot.com

رکھ دیا۔

ماسٹر مراد نے دو تین بار پانی کے چھپاکے منہ پر مارے، سر پر پانی کا ہاتھ پھیرا اور اُٹھ گئے۔ جھک کر اپنی قمیص سے منہ پونچھ لیا۔ جیب سے عینک نکال کر لگالی اور جھولے میں جھولنے لگے۔ ابھی بیڑی کے دو چار کش ہی لگائے تھے کہ ماسٹرنی سلور کی پلیٹ میں کھچڑی لے آئیں۔ پلیٹ کے کنارے پر ایک ٹوٹا چمچہ رکھا تھا۔

''رفیق کہاں ہے؟''

''صبح سے گیا ہے ابھی تک نہیں آیا۔'' ماسٹرنی کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''آنے دو سالے کو، آج اُس کی کھال اُدھیڑ کر رکھ دوں گا۔ اُس نے بڑا ناک میں دم کیا ہے۔ پڑھنے بٹھایا تو اسکول سے بھاگنا شروع کر دیا۔ تنگ آ کر تالوں کے کارخانے میں کام سیکھنے کے لئے بھیجا۔ وہاں سے بھی غائب..... آج آجائے ذرا.....''

''مجھ سے دو آنے مانگ رہا تھا۔ میرے پاس تھے نہیں بس اس بات پر پیر پٹکتا ہوا چلا گیا۔''

''میں دوں گا..... اُس سالے کو ہرے ہرے نوٹ ذرا آجائے۔''

کھانے کیلئے چمچہ اُٹھایا تو فوج نظر آئی جو چارپائی گھیرے کھڑی تھی اور حملہ کرنے کی فکر میں تھی۔

''ارے ان بچوں کو کھچڑی نہیں دی۔''

''سب کو دیدی۔ تم مت دینا، سب کا پیٹ بھرا ہوا ہے۔''

''ہم تو اور کھائیں گے۔''

بچوں کو ضد پکڑتے دیکھ کر، ماسٹرنی نے پکارا۔

''چلو ادھر آؤ کم بختو!..... میں دوں۔''

سب ماسٹرنی کی طرف چیل کی طرح جھپٹے۔ ماسٹرنی نے ایک پلیٹ میں تھوڑی سی کھچڑی نکال کر کونڈے کے نیچے رکھ دی۔ ہنڈیا میں پانچ چھ لقمے کی کھچڑی اور بچی تھی۔ انہوں نے ذرا سی کھچڑی ہر ایک کے پیالے میں رکھ دی۔ ماجدہ کھا چکی تھی۔ رفیق کے لئے انہوں نے کونڈے کے نیچے رکھ دی تھی۔ ہنڈیا صاف ہو چکی تھی اور وہ بھوکی تھیں۔

انہوں نے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا اور ماسٹر مراد کے آگے سے پلیٹ اُٹھا کر برتنوں کے پاس رکھ

دی۔ اندر سے دوسری چارپائی نکال لائیں جو قدرے اچھی تھی بچھا کر بولیں۔ ''اس پر بیٹھ جاؤ۔''

ماسٹر مراد، بیڑی کا دم لگاتے ہوئے دوسری چارپائی پر اطمینان سے بیٹھ گئے۔

''تنخواہ مل گئی۔'' ماسٹرنی نے پوچھا۔

''ہاں یہ لو۔'' انہوں نے جیب سے روپے نکالے۔

''میں کیا کروں گی۔ تمہیں رکھو۔ یہ سوچو کس کس کا دینا ہے۔''

''دنیا بھر کا۔''

ماسٹر اور ماسٹرنی بہت دیر تک سر جوڑے بیٹھے رہے مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے کہ کس کو دیں اور کس کا روک لیں۔ جب چادر ہی ایک گز کی ہو تو پیر کھلیں گے چاہے کتنا ہی سکڑ کر لیٹو۔

نو بجے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ماسٹر مراد کا دل دھڑکا، کہیں کوئی قرضدار تو نہیں آدھمکا۔ پھٹی پھٹی کمزور آواز میں بولے۔ ''کون ہے؟''

''میں ہوں'' ماسٹر صاحب سے بھی کمزور آواز میں کہا گیا۔ ماسٹرنی نے اُٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ رفیق سر جھکائے داخل ہوا۔

''کہاں تھا بے۔'' ماسٹر مراد دھاڑے۔

جواب ندارد۔

''ابے سنا نہیں۔ میں کچھ کہہ رہا ہوں۔'' لیکن رفیق چپ رہا۔

''اب کھڑا کھڑا کیا کر رہا ہے۔ کمبخت کونڈے کے نیچے کھچڑی رکھی ہے جانگل۔'' ماسٹرنی نے قصہ ختم کر دیا۔

ماسٹر صاحب نے جیب سے بیڑی نکالی اور چولہے کی طرف دیکھنے لگے۔

''کیا چاہئے..... کوئلے۔''

''ہاں۔''

''ٹھہرو میں دیکھتی ہوں۔''

''تم بیٹھو..... رفیق دیکھ چولہے میں آگ ہے۔''

''جی ہے..... ابا جان۔''

urdunovelist.blogspot.com

"لا۔"

ماسٹر مراد نے رفیق سے چمٹا لے کر اپنی بیڑی سلگائی جس میں جلتا ہوا کوئلہ دبا ہوا تھا۔ ایک لمبا کش لیا اور ناک منہ سے دھواں نکالتے ہوئے کمر چارپائی سے لگالی۔

ماسٹر مراد کے یہاں دو چارپائیاں تھیں۔ ایک جھنگولا جس پر ماسٹرنی پڑ رہتی تھیں اور دوسری قدرے ٹھیک تھی جس پر مراد لوٹ لگاتے تھے۔ باقی بچوں کے لئے دس بارہ بوریوں کو جوڑ کر فرش بنایا گیا تھا۔

بچوں کا بستر برآمدے میں تھا۔ ان دونوں کی چارپائیاں باہر صحن میں۔ سب لوگ سو رہے تھے مگر ماسٹر مراد کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

آدھی رات بیت چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ چاندنی چوروں کی طرح آہستہ آہستہ گھر میں اُتر رہی تھی اور تارے غافل چوکیدار کی طرح سو رہے تھے۔ وہ کچھ بے چین سے تھے۔ انہیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ انہوں نے کروٹ لے کر گردن اُٹھائی۔ رفیق اوندھا پڑا تھا اور ماجدہ کروٹ لئے سو رہی تھی۔ باقی بچے ایک دوسرے پر چڑھے چڑھائے نیند کے مزے لے رہے تھے۔

وہ آہستہ سے اُٹھے اور ماسٹرنی کی چارپائی کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ ماسٹرنی سینے پر ہاتھ رکھے کوئی خواب دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے ماسٹرنی کا ہاتھ پکڑ کر سہلایا۔ نیند کا جال ٹوٹا۔ ان کی آنکھ کھلی اپنی چارپائی کے پاس کسی کو کھڑا دیکھ کر چیخنے ہی والی تھیں کہ ماسٹر مراد نے اُن کا منہ دبوچ لیا اور منمنائے۔ "میں ہوں۔"

"کیا بات ہے..... ابھی تک سوئے نہیں۔" انہوں نے ہاتھ ہٹاتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

"ذرا آ جاؤ..... نیند نہیں آ رہی ہے۔"

ماسٹرنی نہ چاہتے ہوئے بھی ماسٹر مراد کی چارپائی تک پہنچ گئیں اور تھوڑی دیر میں جب ماسٹر مراد، ماسٹرنی کے سینے پر سر رکھ کر ہانپنے لگے تو ماسٹرنی فکرمند لہجے میں بولیں۔

"کیوں جی..... تمہیں لڑکی کا بھی کچھ خیال ہے، جوان جہاں بیٹھی ہے۔ اس کو نکالنے کا کوئی بندوبست کرنا ہے کہ نہیں..... اگر ذرا میں کچھ لے دے ہوگئی تو شرم سے گردن بھی نہ اُٹھے گی۔"

"فکر تو بہت ہے۔ کئی لوگوں سے کہہ رکھا ہے مگر لڑکا کہاں ملتا ہے اور اگر کوئی ملتا بھی ہے تو اُسے

جہیز چاہئے۔"

"تو کیا لونڈیا کو یوں ہی بٹھائے رہو گے۔"

"نہیں جیسے ہی کوئی انتظام ہوگا فوراً بیاہ دیں گے۔"

لیکن بیٹی نے خود ہی اپنا انتظام کر لیا اور ایک اندھیری رات کو چپکے سے گھر سے نکل گئی۔ اسے ماں باپ پر اپنے بوجھ بنے رہنے کا اب خود بھی احساس ہو چلا تھا اور اپنے بارے میں ان کی تشویش اور پریشانی کی سن گن بھی اسے ملتی رہتی تھی۔

وہ کنجڑے رشید کے لڑکے نصیر کے ساتھ بھاگی تھی۔ رشید کی سبزی منڈی میں بہت بڑی دکان تھی اور وہ شہر کی چھوٹی چھوٹی دکانوں پر سبزی سپلائی کرتا تھا۔

باپ جتنا شریف تھا، لونڈا اتنا ہی بدمعاش تھا۔ چھٹی جماعت تک اس کی تعلیم تھی۔ فلم دیکھنا اور فلم دیکھ کر ڈائیلاگ بولنا، پان والے کی دکان پر ریڈیو سننا، سگریٹ کو دھواں بنانا، راہ چلتی لڑکیوں کو چھیڑنا اور کبھی کبھی مانگ پتا کھیلنا اس کا محبوب مشاغل تھے۔

ایک دن اُس نے ماجدہ کو دروازے پر کھڑا دیکھ لیا۔ ایسی بھری بھرائی لونڈیا کو دیکھ کر اس کی طبیعت مچل گئی۔ اس نے روز دروازے کے چکر کاٹنے شروع کر دیئے۔ وہ ماجدہ کی چھوٹی بہن پروین سے کہتا۔ "اپنی باجی کو میرا اسلام کہنا۔"

پھر کچھ دنوں بعد سلاموں کی جگہ پیاموں نے لے لی۔ پیام آتے جاتے رہے اور آخر ایک روز وہ بھی آیا جب دونوں کی ملاقات حضرت چنڈو شاہ کے مزار پر ہوئی۔

ماسٹرنی کی طبیعت اچھی نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے ماجدہ کے ہاتھ میں ڈھائی آنے تھما کر، پروین کو ساتھ کر کے حضرت چنڈو شاہ کے مزار پر بھیج دیا کہ وہ جا کر بتاشوں پر نیاز دلوا لائے۔

مزار گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔ وہ گئی مگر ایک گھنٹے میں واپس آئی۔ ماسٹرنی نے ٹوکا۔ "اتنی دیر کہاں لگائی؟"

"وہ امی بات یہ تھی کہ میں وہاں سے تو بہت دیر کی آ گئی تھی۔ راستے میں کنیز مل گئی، وہ اپنے گھر لے گئی بس وہیں سے آ رہی ہوں۔"

اُس کے بعد ماسٹرنی کی آنکھ لگ گئی جب کھلی تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

urdunovelist.blogspot.com

آج اسے گئے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا اور اس ایک مہینے میں ماسٹرنی رو پیٹ کر خاموش ہو گئی تھیں۔ ماسٹر مراد کا غصہ بھی سرد پڑ گیا تھا۔

ایک رات کی بات ہے۔ قریب تین بجے کسی نے ماسٹر مراد کے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

کوئی جواب نہ ملا۔ سب بے خبر سو رہے تھے۔ دوسری بار دستک ذرا زور سے دی گئی۔ ماسٹرنی نے کروٹ بدلی اور سو گئیں۔ تیسری بار کنڈی اونچے سروں میں کھٹکی۔ ماسٹرنی کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے فوراً ماسٹر مراد کو جگایا۔

''ارے سنتے ہو، دیکھو دروازے پر کون ہے؟''

ماسٹر مراد ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے اور بیٹھے بیٹھے اونگھتی آواز میں بولے۔ ''کون ہے؟''

جواب نہیں ملا۔

''ارے بولتے کیوں نہیں، کون ہے؟''

جواب میں کنڈی ہلائی گئی اور بس۔

ماسٹر مراد اپنا تہبند سنبھالتے ہوئے اُٹھے۔ لالٹین کی بتی اونچی کی اور دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھلا ماسٹر مراد نے لالٹین اونچی کر کے دستک دینے والے کو دیکھا۔

ماجدہ نقاب اُلٹے اور سر جھکائے کھڑی تھی۔

اُسے دیکھتے ہی ماسٹر مراد کے جسم میں کپکپی دوڑ گئی اور وہ اُس کے منہ پر لالٹین مارنے ہی کو تھے کہ ماجدہ نے سر اُٹھایا اور خالی خالی آنکھوں سے دیکھا۔ درد کا دریا اُس کی آنکھوں میں کروٹیں لے رہا تھا۔ کرب کے آثار چہرے پر نمایاں تھے۔ یکا یک بند ٹوٹ گیا اور دریا تیزی سے بہہ نکلا۔

ماسٹر مراد کو محسوس ہوا کہ وہ دریا میں ڈوبے چلے جا رہے ہیں۔ پانی اُن کے گلے تک آ پہنچا ہے اور جیسے ہی انہوں نے بچنے کیلئے ہاتھ پاؤں مارے اُس وقت تک ماجدہ گھر میں داخل ہو چکی تھی۔

□□

شاطر

آج اچانک سردی بڑھ گئی تھی۔ درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے بھی نیچا تھا۔

پورا شہر دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ سورج نکل آیا تھا لیکن سورج کی کرنوں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ دھند کی موٹی چادر کو کاٹ کر دھرتی کے پہلو کو گرما سکیں۔ سورج کی آگ جیسے ٹھنڈی ہو گئی تھی..... ٹھنڈا سورج!

کہرا اتنا گہرا تھا کہ دس قدم دور کی چیز سجھائی نہ دیتی تھی۔ ہر طرف دھواں دھواں سا تھا۔ چھری کی طرح تیز اور برفیلی ہوا چل رہی تھی۔ جس سے ہڈیاں تک سن ہوئی جا رہی تھیں۔

تراہا ابھی تک ویران پڑا تھا۔

سات بج چکے تھے۔ اِکا دُکا آدمی لحاف یا کمبل اوڑھے ہانپتے کانپتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ یا کبھی جی ٹی روڈ سے ٹرک گزر جاتے تھے۔ یہ سکھ بھی پتہ نہیں کس مٹی کے بنے ہیں۔ اس سردی میں اچھا بھلا آدمی برف ہوا جاتا تھا مگر ان پر کوئی اثر نہ تھا یہ معمول کی طرح ٹرک چلا رہے تھے۔

آج تو سندھی پان والا بھی اپنی دکان ابھی تک نہ کھول سکا تھا۔ حالانکہ اس کی دکان چھ بجے ہی کھل جاتی تھی مگر آنند اپنا چائے کا ہوٹل کھول چکا تھا اور بتیسی بھینچے بھٹی سلگا رہا تھا۔ پاس ہی کتے کا چھوٹا سا پلا ٹھنڈ سے تھر تھر کانپ رہا تھا اور ''ٹیاؤں ٹیاؤں'' کی باریک آواز منہ سے نکال رہا تھا۔

urdunovelist.blogspot.com

جیسے کراہ رہا ہو۔ مگر اس بے زبان کی فریاد سننے والا کون تھا۔

اس نے بہت مشکل سے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو سیدھا کیا اور پھر آہستہ آہستہ ایک ہاتھ کی ہتھیلی سے دوسرے ہاتھ کی پشت کو رگڑنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے ہاتھوں میں ذرا ذرا گرمی محسوس کی۔

اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن کمر اور گھٹنوں نے جواب دے دیا۔ اس نے کمر اور گھٹنے سہلائے اور پھر ہمت کر کے کھڑی ہوگئی۔ ٹانگیں پھر بھی کانپتی رہیں۔ اپنے پھٹے ہوئے دوپٹے سے جوان سینے کو ڈھانکنے کی کوشش کی تو اس کوشش میں پیٹھ ننگی ہوگئی۔ برفیلی ہوا سرنج کی سوئی کی طرح چبھنے لگی۔

لیکن اس نے اس کی پروا نہ کی۔ سینہ ہی ڈھکا رہنے دیا۔ ہوا تو دونوں ہی طرف سے اس کے جسم کو منجمد کیے دے رہی تھی۔ اُسے اس وقت آگ کی سخت ضرورت تھی۔ اُس آگ کی جس کا کام صرف جلانا ہے۔ اُس آگ کی جو جنگل میں لگ جائے تو بجھانا مشکل ہو جائے۔ اُس آگ کی جو بہت بھیانک ہے..... اسے آگ کی سخت ضرورت تھی اور وہ آگ کی تلاش میں تراہے کی طرف چل دی۔

اس کا خیال ٹھیک نکلا۔

چھدا حلوائی اپنی بھٹی سلگا رہا تھا۔ وہ لحاف اوڑھے بیٹھا تھا اور بھٹی کو پنکھا جھل رہا تھا۔ ساتھ ہی منہ سے عجیب عجیب آوازیں بھی نکالتا جاتا تھا۔ وہ چھدا حلوائی کی دکان پر بھاگ کر پہنچی اور اپنے ہاتھ بھٹی پر رکھ دیئے۔

''کون ہے ری تو؟'' چھدا حلوائی نے اپنی ملگجی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا جن سے پانی بہہ رہا تھا۔

''مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے بابا۔'' وہ بہت مشکل سے بولی۔

''تو میں کیا کروں؟'' چھدا حلوائی نے اپنا لحاف سہلایا۔

''مجھے ذرا یہاں کھڑا رہنے دو۔''

''اگر تجھے ہاتھ سینکنے ہیں تو پہلے بھٹی دہکا۔ یہ لے پنکھا۔'' اس نے پنکھا پھینکا۔

''مجھ سے نہیں جھپکی جائے گی بابا..... میرے ہاتھ جکڑے ہوئے ہیں؟''

''تو پھر آگے بڑھ۔'' اس نے پنکھا پھینکتے ہوئے کہا۔

وہ کھڑی سوچتی رہی پھر بولی۔ ''لاؤ بابا پنکھا۔''

وہ پنکھا ہلانے لگی۔ ہاتھوں نے انکار کیا لیکن وہ نہ مانی پنکھا ہلاتی رہی اور بھٹی دہکتی گئی۔ وہ بھٹی سے اُبھرتی ہوئی گرم لپٹوں کو خوش ہو ہو کر دیکھتی رہی۔

''بس بابا۔''

''ہوں۔''

وہ جلدی سے اُٹھی اور اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ لیکن اس کے ہاتھوں نے گرمی محسوس نہ کی۔ چھدا حلوائی نے بھٹی پر کڑھائی رکھ دی تھی۔ اس نے چھدا حلوائی کو دیکھا جو صرف ایک آنکھ کا تھا۔ اس کی مجبور نگاہیں کہہ رہی تھیں۔

''یہ کیا بابا؟''

''اری تو مجھے گھور گھور کر کیا دیکھ رہی ہے..... کیا اپنا کام نہ کروں؟ اگر تجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے تو میرے پاس بیٹھ جا میرے لحاف میں! دیکھ کتنا دہک رہا ہے بھٹی سے بھی جیادہ..... کل ہی تو اس میں ڈھائی سیر روئی ڈلوائی ہے۔''

''گریبوں کی بھی اجت ہوتی ہے بابا۔'' یہ کہہ کر وہ چل دی۔

''ارے جا جا..... آئی بڑی اجت والی والی۔ تن پر کپڑا نہیں۔ اجت والی بنی پھرتی ہے۔'' وہ کھوسٹ بڑبڑاتا رہا۔

☆.....☆.....☆

اور جب بندو چائے والے نے اپنے ہوٹل کے سامنے ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا تو وہ بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ''کیا چاہیے؟''

''چائے۔'' وہ بولی۔

''پیسے ہیں۔''

اس نے گردن انکار میں ہلائی۔

urdunovelist.blogspot.com

''کائے میں لے گی چائے۔''

''یہ کلڑ ہے۔''

بندو نے ایک پیالی چائے اس کے کلڑ میں انڈیل دی۔ چائے کے گھونٹ کے ساتھ اس نے اپنے بدن میں گرمی اُترتی محسوس کی لیکن چائے جلد ہی ختم ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی گرمی بھی۔

''میں بھٹی کے پاس کھڑی ہو جاؤں۔'' اس نے بڑے معصوم لہجے میں کہا۔

''کیوں؟'' وہ جانتے ہوئے بھی انجان بن گیا۔

''مجھے ٹھنڈ لگ رہی ہے۔''

''چل تھوڑی دیر کے لئے کھڑی ہو جا۔''

وہ بھٹی پر جھک گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ بالکل آگ کے قریب کر دیئے اور پھر اپنے ہاتھوں سے اپنا سینہ سینکنے لگی۔

''مجھے ایک لحاف چاہئے۔''

''لحاف؟''

''ہاں..... بابو میرے پاس اوڑھنے کو کچھ بھی نہیں۔ میں ٹھنڈ سے مری جا رہی ہوں۔''

''تو رات کو رہتی کہاں ہے؟''

''میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔''

''تیرا کوئی اور نہیں۔''

''نہیں۔'' اس نے سردی میں بڑی ٹھنڈی سانس لی۔

بھٹی کے پاس کھڑے ہوئے شنکر دادا نے بندو کو آنکھ ماری۔ ''استاد! مال بڑا فرشٹ کلاس ہے۔''

بندو صرف مسکرا دیا۔

''میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ تجھے لحاف دلوا دوں۔ ہاں یہ اٹھنی ضرور ہے۔ یہ لے جا کچھ کھا پی لینا۔''

اس نے اٹھنی لے لی۔ دل ہی دل میں دعائیں دیں اور چل دی۔

شنکر دادا نے بندو کو گھورا۔

بندو ایک بار پھر مسکرا دیا۔

☆.....☆.....☆

''بابو مجھے لحاف دلوا دو..... میں سردی میں مری جا رہی ہوں۔''

چلتا راہ گیر رک گیا۔ وہ کوئی سوٹ پوش نوجوان تھا۔ اس نے اُسے اوپر سے نیچے تک گھورا اور پھر بولا۔ ''تمہیں لحاف چاہئے۔''

''ہاں! بابو..... دلوا دو گے نا۔''

''ارے تم تو خود چلتی پھرتی انگیٹھی ہو۔ تمہیں لحاف کی کیا ضرورت۔''

وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ کچھ کہہ نہ سکی۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ گرم آنسو..... جو آنکھوں میں آتے ہی یخ ہو گئے تھے۔

وہ شام تک یوں ہی ایک ایک سے لحاف مانگتی رہی اور جواب میں طرح طرح کے جملے اور حرکتیں برداشت کرتی رہی۔ وہ لحاف چاہتی تھی اور لوگ بھی اس سے کچھ چاہتے تھے۔ گرمی کے بدلے گرمی۔ لیکن اسے یہ شرط منظور نہ تھی۔ تعجب ہے ایک جوان بھکارن کو یہ معمولی سی شرط منظور نہ تھی۔

بازار کا وقت اگرچہ رات آٹھ بجے تک تھا۔ مگر آج تو دکاندار چھ بجے سے ہی دکانیں بند کر کے بھاگ رہے تھے۔ کچھ ہی گھنٹوں میں شہر خاموشی کے سمندر میں ڈوب گیا۔ سڑکیں ویران ہو گئیں۔ گلی کوچے خاموش ہو گئے۔ گھروں کے دروازے بند ہو گئے۔ لوگ لحافوں میں دبکے اس کڑاکے کی ٹھنڈ سے نجات پانے کی دعا کر رہے تھے۔

گلی کے آوارہ کتے کونے بچالوں میں منہ دیئے سکڑے سکڑائے پڑے تھے۔

ٹھنڈ اور بڑھ گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بارش ہونے والی ہے۔

چھدا حلوائی دکان بند کر کے جا چکا تھا۔ دکان کے سامنے رکھی ہوئی بڑی بھٹی میں ابھی آنچ تھی۔

شاید چھدا جلدی جلدی میں بجھانا بھول گیا یا پانی میں ہاتھ ڈالنے کی وہ جرأت نہ کر سکا۔

چھدا حلوائی کی دکان میں ایک بڑی سی چوکی پڑی تھی۔ جس پر وہ مٹھائیوں کے تھال سجاتا تھا۔ اوپر ٹین کا سائبان تھا۔

urdunovelist.blogspot.com

وہ بھٹی کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی اور اس پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کی پیٹھ سن ہوگئی تھی۔ وہ جلدی جلدی اپنے جسم کے ایک ایک عضو کو سینکنے لگی..... کیونکہ بھٹی زیادہ دیر تک چلنے والی نہ تھی۔

جب تک جسم آگ کے سامنے رہا۔ سردی شدت سے نہ لگی لیکن آگ بجھتے ہی سردی نے پھر شدت اختیار کر لی۔

وہ اکڑوں بیٹھ گئی۔

اس نے پھٹے ہوئے دوپٹے سے اپنی پیٹھ ڈھک لی اور اپنے ننگے اُبھاروں کو گھٹنوں کے درمیان دبا لیا اور بانہوں کو گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیا۔

پھر ایک قیامت اور ٹوٹی..... بارش شروع ہوگئی۔

کئی گھنٹے کے بعد اُس نے اپنے سینے میں درد محسوس کیا۔ کمر اکڑ چکی تھی۔ کان سن ہو چکے تھے۔ ہاتھ پاؤں برف سے بھی ٹھنڈے ہوگئے تھے۔

سینے کا درد بڑھ رہا تھا۔ ٹیسیں اُبھر رہی تھیں۔ اس نے ہاتھوں سے اپنا سینہ سہلانا چاہا لیکن کوشش کے باوجود ہاتھ نہ اُٹھا سکی۔ ہاتھوں کی رگوں کا خون جم گیا تھا۔

وہ رونا چاہتی تھی، چیخنا چاہتی تھی، مگر وہ نہ رو سکی اور نہ ہی آواز منہ سے نکلی۔

اسے محسوس ہوا جیسے موت کا فرشتہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا ہے..... موت..... بھیانک موت۔

تب ہی کوئی سایہ چھدا حلوائی کی دکان پر چڑھا۔ وہ ایک موٹے لحاف میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ موت کا فرشتہ ہرگز نہ تھا۔ اس نے اپنا لحاف اس جوان بھکارن پر ڈال دیا اور لاپروائی سے ایک طرف چلا گیا۔

وہ بندو چائے والا تھا۔

اس نے جلدی سے لحاف کو اپنے چاروں طرف لپیٹ لیا۔ وہ لحاف ڈالنے والے کو دعائیں دینے لگی۔ وہ کیا اس کے جسم کا رواں رواں لحاف ڈالنے والے کو دعا دے رہا تھا۔ اس نے سوچا دنیا میں ابھی فرشتہ صفت انسان زندہ ہیں۔ ان ہی کے دم سے تو یہ دنیا قائم ہے جس دن یہ نہ ہوں گے قیامت آجائے گی۔

لحاف کی وجہ سے سردی کی شدت میں خاصی کمی آگئی تھی۔ چوکی پر لیٹ کر اس نے لحاف کا آدھا حصہ اپنے جسم کے نیچے کر لیا اور آدھا اوڑھ لیا۔ لحاف کی ہلکی ہلکی آنچ نے اُس پر غنودگی طاری کر دی تھی۔

ابھی وہ سو بھی نہ پائی تھی کہ کسی نے آکر اس کا لحاف اُلٹ دیا۔ ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور وہ ٹھٹھر گئی۔

اس نے فوراً لحاف سمیٹ کر اوڑھ لیا اور کانپتی آواز میں بولی۔ ''کون؟''

''میں ہوں..... بندو چائے والا..... لا اب لحاف دے دے، تیری سردی ختم ہوگئی ہوگی۔ اب مجھے سردی لگ رہی ہے۔''

وہ سوچتی رہی مگر فیصلہ نہ کر سکی..... لحاف دے یا نہ دے۔

بندو چائے والا اُسے خاموش پا کر دل ہی دل میں مسکرایا۔ اور بولا۔ ''اچھا رہنے دے۔ میں بھی اسی لحاف میں لیٹا جاتا ہوں۔''

اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر بندو چائے والا لحاف میں گھس گیا۔ □□

urdunovelist.blogspot.com

ہم اور وہ

تھرڈ کلاس کے ڈبے میں گھستے ہی اُسے محسوس ہوا کہ وہ کسی دوزخ میں چلا آیا ہے۔ آج کے دن بھیڑ کی حد ہوگئی تھی۔ لوگ ایک دوسرے پر اینٹ گارے کی طرح چنے ہوئے تھے۔

آج گنگا اشنان تھا۔

دیہاتیوں کے جسم سے پھوٹتی ہوئی بو اس کی ناک میں رینگ گئی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا مگر ڈبے میں داخل ہونے والے اُجڈ دیہاتیوں کی دیوار، اس کے راستے میں حائل ہوگئی۔ وہ بھنچ کر رہ گیا۔

سگنل ہوا۔ گارڈ نے سیٹی دے کر ہری جھنڈی دکھائی۔ آہستہ آہستہ گاڑی نے اسٹیشن چھوڑنا شروع کر دیا۔

''بول گنگا مائی کی۔''

''جے''

جے جے کار سے ڈبہ گونج کر رہ گیا۔ جو لوگ اندر نہ داخل ہو سکے وہ ڈنڈوں سے لٹک گئے۔ وہ خوش تھے جیسے بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہاتھ آ گئی ہو۔

گاڑی نے پٹری بدلی اور تیز ہوگئی۔

''اے بابو دھکا کاہے دیوے ہے۔ ہم ابھئی جا پڑتے۔'' ایک پگڑی والے نے اپنی جیب پر

ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اسے کوئی جیب کترا سمجھ رہا تھا۔

وہ لوگوں کے درمیان بھنچتا بھنچاتا، سکڑتا سکڑاتا آگے بڑھ گیا۔ اس نے پگڑی والے کی بات کا کوئی اثر نہیں لیا۔

''بھیتر کاں جات ہو پلمان ..... واٹھور نیک جگے ناہیں۔'' ایک پہلوان نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اُسے اندر جانے سے ٹوکا۔

''تم فکر مت کرو دوست ..... میں جگہ بنالوں گا۔'' اس کا لہجہ سلجھا ہوا تھا۔

''تمری مرجی ..... لیو پلمان ..... گھسو۔'' پہلوان نے جگہ چھوڑ دی مگر ہاتھ مونچھوں پر ستار بجاتے رہے۔

اس نے اندر پہنچ کر ٹھنڈی سانس لی۔ اب وہ تازہ ہوا کے جھونکے بھی محسوس کر رہا تھا۔ ایک نظر اس نے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ لاتعداد سلوٹیں اس کی پینٹ اور بش شرٹ پر پڑ گئی تھیں۔

ڈبے میں تین پارٹیشن تھے۔ ہر پارٹیشن میں دو لمبی بنچیں جڑی ہوئی تھیں۔ اندازاً بارہ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ ہر پارٹیشن میں۔ اوپر لگیج سیٹ تھیں اور پارٹیشن کے سامنے کھڑکی سے ملی ہوئی دو سیٹیں اور تھیں۔

پورے ڈبے میں آدھے سے زیادہ گاؤں والے تھے جسے جہاں جگہ مل گئی تھی۔ وہ خدا کا شکر کیے بیٹھا تھا۔ کوئی ڈبے کے فرش پر تو کوئی سیٹ پر اور بھی نہیں تو لگیج سیٹ پر اور لگیج سیٹ پر بھی دال نہ گلی تو کسی کا کندھا پکڑے یا لاٹھی کی ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

اب رہے شہری ایک تو تھے ہی کم اور جو پارٹیشن کے اندر تھے وہ لمبے چوڑے دیہاتیوں کے درمیان دب کر رہ گئے تھے۔ کچھ پارٹیشن کے سامنے والی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ سیٹ بنائی تو ایک ہی کے لئے گئی تھی مگر اتنی لمبی چوڑی تھی کہ دو مسافر آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔

ایک وکیل صاحب موٹی عینک لگائے اپنی شریمتی جی کی کمر میں ہاتھ ڈالے بیٹھے تھے اور دوسرا ہاتھ اگر ستار نہیں تو بانسری ضرور بجا رہا تھا۔

اس کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وکیل صاحب نے کمر سے ہاتھ نکال دیئے اور پھیل کر بیٹھ گئے، ڈر تھا کہ وہ یہیں آ کر نہ بیٹھ جائے۔

urdunovelist.blogspot.com

اس سے اگلی سیٹ پر دو سادھو براجمان تھے۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بیٹھے تھے۔ شاید یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ یہ گنگا اشنان ان کے لئے کہاں تک نفع بخش ثابت ہوگا۔

اُس نے ڈبے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگایا مگر کہیں کوئی جگہ نظر نہ آئی۔ سوائے ان دونوں سیٹوں کے جہاں پر ایک نئی نویلی دلہن سمٹی ہوئی بیٹھی تھی اور اس کے سامنے والی سیٹ پر لالہ دولت رام جی پھیلے بیٹھے تھے جو نئے نئے لیڈر بنے تھے اور اس دفعہ میونسپلٹی کے الیکشن میں ہار چکے تھے۔

اگرچہ نئی نویلی دلہن کے پہلو میں کافی جگہ خالی پڑی تھی مگر وہاں بیٹھنا چاند کے بال کم کرانے کے مترادف تھا۔

وہ ہمت کر کے لالہ دولت رام جی کی طرف بڑھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ سفر لمبا تھا اسے جانا بھی دور تھا۔ اس نے سوچا اس طرح کھڑے کھڑے تو میں اشوک کی لاٹ بن جاؤں گا۔

لالہ دولت رام جی نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو ہاتھ پیر اور پھیلا دیئے مگر باوجود کوشش کے پوری سیٹ نہ گھیر سکے۔

وہ بیٹھ ہی گیا۔

لالہ دولت رام جی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ بھنویں کھنچ کر کمان بنیں۔ ناک سکڑ کر چھوارا ہوئی۔ آنکھوں نے شعلے برسائے لیکن کچھ ہی سیکنڈ کے لئے اس کے بعد ہر چیز اپنی جگہ صحیح حالت پر آ گئی۔

وہ بیٹھ تو گیا لیکن اطمینان سے نہیں۔ اس لئے اس نے لالہ دولت رام جی کو آہستہ آہستہ دھکیلنا شروع کر دیا۔

''اے مشٹر..... ایک تو جبر دستی سیٹ پر بیٹھ گئے اور اوپر سے دھکا کی آرمبھ کر دی۔'' دولت رام جی چڑ کر بولے۔

''تو پھر پیچھے کھسک جایئے نا۔'' اس نے ڈھٹائی دکھائی۔

''بہت کھوب..... اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔''

''لالہ جی زبان کو لگام دیجئے۔ چور ہوں گے آپ۔ مجھے چور کہا تو اچھا نہ ہوگا۔''

''ایسے ہی ناک والے ہو تو دوسری جگہ بیٹھ جاؤ۔''

''ناک والے تو آپ بھی ہیں۔ آپ کیوں نہ دوسری جگہ بیٹھ جائیں۔''

''دوسری جگہ کیوں بیٹھ جائیں جی۔ کرایہ جو خرچ کیا ہے۔''

''اور میں بغیر ٹکٹ جا رہا ہوں؟''

''ہمیں کیا پتہ جی۔'' لالہ جی نے لاپروائی سے ہاتھ پیر پھیلا دیئے۔

''دیکھو لالہ جی میں تمہارے لابھ (فائدے) کی کہتا ہوں۔''

''ہمیں کچھ نہیں سننا جی۔''

''آپ جانتے ہیں..... میں کون ہوں۔''

''کسی گورنر کے بیٹے ہو کیا؟'' لالہ دولت رام جی نے گولی داغی۔

''نہیں..... ایک بھنگی کا۔''

''کیا.....؟''

لالہ دولت رام جی کسی اسپرنگ کی طرح اُچھلے اور اپنی نئی نویلی دلہن کی بغل میں جا بیٹھے۔

''ہے رام، رام..... میرا دھرم نشٹ کر دیا۔''

وہ اُسے بڑی اسپیڈ سے گالیاں دے رہے تھے اور وہ بڑی معصوم نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

گالیاں دیتے دیتے اُن کی نظر مٹھائی کی ٹوکری پر پڑی وہ اور بھی بھڑک اُٹھے۔

اس نے جھک کر دیکھا سیٹ کے نیچے ایک بڑی سی ٹوکری رکھی ہوئی تھی اور اس کے پاؤں اس سے چھو رہے تھے۔ جلدی سے اس نے پاؤں کھینچ لئے۔

''اب کیا کرے گا ہٹا کر، کمینے تو نے ٹوکری اپوتر (ناپاک) کر دی۔ اب میں اس کا کیا کروں گا۔'' لالہ دولت رام جی نے ٹوکری باہر پھینکنے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔

''اسے پھینکئے مت..... مجھے ہی دے دیجئے۔'' اُس نے جلتی پر پیٹرول چھڑکا۔

''لے تو ہی لے۔''

لالہ جی نے ٹوکری اُس کے منہ پر دے ماری۔ اُس نے ہاتھ پر روک لی اور ناک پچکتے پچکتے رہ گئی۔

urdunovelist.blogspot.com

اب گاڑی میں بریک لگنے شروع ہوئے۔

ستم گڑھ آ گیا تھا۔ اُس نے ٹوکری کھولی۔ وہ برفی کھانے ہی والا تھا کہ کسی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

ہاتھ کھڑکی کے باہر سے آیا تھا۔

''کیوں بھئی علیم..... یہ مٹھائی اکیلے اکیلے اُڑائی جائے گی کیا؟''

علیم نے گھوم کر دیکھا۔ باہر گوپال کھڑا مسکرا رہا تھا۔

اور لالہ دولت رام جی اس اُدھیڑ بن میں تھے کہ مٹھائی کی ٹوکری واپس لیں یا نہیں؟ □□

دھوکے باز لفظ

وہ دہلی میں نیا نیا آیا تھا۔

دہلی اسٹیشن سے نکل کر جب وہ سڑک پر آیا تو ٹریفک کے شور نے اس کا سواگت کیا۔ وہ ایک چھوٹے سے پُرسکون شہر کا باسی تھا۔ اتنا ٹریفک دیکھ کر اور ٹریفک کا شور سن کر گھبرا سا گیا۔

دہلی شور وغل، ہنگاموں، دھماکوں اور ہٹو بچو کا شہر ہے۔ اگر اس شہر سے آٹو رکشا نکال دیئے جائیں تو یہ قدرے پُرسکون ہوسکتا ہے۔ آٹو رکشاؤں کی ''پھٹ پھٹ'' سے بہت جلد دماغ بھی ''پھٹ پھٹانے'' لگتا ہے۔

وہ دائیں بائیں دیکھتا ہوا، سڑک پار کرنے لگا۔ حالانکہ وَن وے ٹریفک میں صرف ایک طرف دیکھتے ہوئے سڑک پار کی جاتی ہے۔ وہ انجان ایک چھوٹے سے شہر کا باسی، دونوں طرف دیکھ کر چلنے کا عادی۔ اسے کیا معلوم کہ سڑک کس طرح کراس کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک آٹو رکشا کی زَد میں آتے آتے رہ گیا۔ اسکوٹر چلانے والے سکھ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا ..... بولا کچھ نہیں، حالانکہ اسے اب تک تین سو ساٹھ گالیاں دے دینی چاہئے تھیں۔

اسے دہلی یونیورسٹی جانا تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ اسے یونیورسٹی جانے کیلئے پہلے ''لال قلعہ'' جانا ہوگا۔ وہاں سے پھر بس ملے گی۔ فکر میں ڈوبے ہوئے چہروں، تیز تیز چلتے ہوئے قدموں سے

urdunovelist.blogspot.com

راستہ پوچھتے پوچھتے وہ لال قلعہ پہنچا۔

دہلی یونیورسٹی جانے والی کتنی ہی بسیں اس کے سامنے رکیں۔ لوگ چڑھے اُترے، مگر وہ ''کاٹھ کے الو'' کی طرح کھڑا رہا۔ وہ صرف اس اُمید پر کھڑا رہا کہ کوئی بس ایسی رکے جس میں زیادہ بھیڑ نہ ہو اور وہ بڑے اطمینان سے ٹہلتا ہوا اس پر سوار ہو جائے..... اسے کیا معلوم تھا کہ بس پر سوار ہونے کا موقع دوسروں کو دیا نہیں بلکہ چھینا جاتا ہے۔ بس پر چیل کی طرح جھپٹا مارا جاتا ہے۔ تب کہیں بس کا ڈنڈا ہاتھ میں آتا ہے۔ پورا ایک گھنٹہ برباد کر کے اس کی عقل میں ذرا ذرا یہ بات آئی اور پھر وہ ایک بس میں سوار ہو ہی گیا۔

☆.....☆.....☆

جب وہ آرٹس فیکلٹی سے باہر نکل رہا تھا تو اس کے چہرے پر نراشانہ تھی، بلکہ اُمید کے دیئے جل رہے تھے۔ اُسے دہلی یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تھا۔ وہ خوش خوش بس اسٹاپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

دوپہر ہو چلی تھی۔ گرمیاں تھیں، اس لئے دھوپ میں بلا کی تیزی تھی۔ ''مورس نگر'' کے بس اسٹاپ پر خاصی بھیڑ تھی۔ لڑکوں سے زیادہ لڑکیوں کی تعداد تھی۔ ایسی خوبصورت خوبصورت لڑکیاں تو اُس نے اپنے شہر میں بھی نہ دیکھی تھیں۔

اس نے بہت آہستہ سے ایک اسٹوڈنٹ سے لال قلعہ جانے والی بس کا نمبر پوچھا اور پھر چپ چاپ ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بس آئی۔ وہ بس کی طرف بڑھا۔ لیکن چڑھنا تو درکنار وہ بس کا ڈنڈا بھی نہ چھو سکا۔ لڑکوں نے اسے دھکے دے کر پیچھے کر دیا اور وہ شرافت سے دھکے کھاتا ہوا پیچھے ہٹتا گیا۔ بس نے صرف دس بارہ سواریوں کو لیا اور روانہ ہو گئی۔

وہ حیران تھا ان لڑکیوں کو دیکھ کر جو دھکے کھاتی اور دھکے دیتی ہوئی بس میں سوار ہو گئی تھیں۔ دس پندرہ منٹ کے بعد ایک بس اور آئی۔ لڑکے لڑکیاں بس کی طرف لپکے۔ اس بار اس نے بھی پھرتی دکھائی اور بس میں چڑھنے کے لئے زور لگانے لگا۔ ایک لڑکی اس کے سامنے آ گئی اس پنجابی لڑکی کے سخت کولہے اس کے جسم سے ٹکرائے۔ وہ جھنجھنا اُٹھا..... پھر اچانک کسی نے دھکا دیا۔ وہ لڑکی آگے نکل گئی اور اس کے سامنے لڑکا آ گیا۔ وہ بس کا ڈنڈا پکڑ کر چڑھنے ہی والا تھا کہ کنڈیکٹر نے سیٹی بجا دی۔ بس جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

پھر تیسری بس آئی، چوتھی آئی، پانچویں آئی اور وہ بس میں سوار نہ ہو سکا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ وہ پیچھے سے دھکا دینے والوں کے لئے جگہ چھوڑ دیتا تھا..... اس بار اس نے مصمم ارادہ کیا کہ اس مرتبہ وہ شرافت سے کام نہ لے کر بدمعاشی دکھائے گا اور کسی کو آگے نکلنے کی اجازت نہ دے گا۔ اس طرز فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے بس میں پاؤں رکھنے کی جگہ مل گئی۔

وہ ابھی دروازے میں ہی لٹکا ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ سے برابر لگے ہوئے ڈنڈے کو پکڑ رکھا تھا۔ اور بائیں ہاتھ میں بیگ تھا۔ بس تیزی سے چل رہی تھی۔ اور اس کا دل دھاڑ دھاڑ کر رہا تھا کہ اب ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹا، اور وہ سڑک پر گرا اور پیچھے سے آنے والی بس سے سر بھرتا ہوا۔

کنڈیکٹر جو دروازے پر ہی کھڑا تھا، عادت کے مطابق دروازے میں بھیڑ دیکھ کر اس نے سیٹوں کے درمیان کھڑے ہوئے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''آگے بڑھتے رہو بھائی..... آگے بڑھتے رہو۔''

کوئی اسٹاپ آیا۔ کچھ لوگ نیچے اُترے اور کچھ چڑھے۔ وہ بھی لوگوں کے ساتھ نیچے اوپر ہوا اور آخر میں اسے سیٹوں کے درمیان کھڑے ہونے کی جگہ مل ہی گئی۔

بس کی چھت میں لگے ہوئے ڈنڈے کو اس نے ایک ہاتھ سے بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا لیکن اس کے باوجود وہ کٹھ پتلی کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔ ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ پاؤں کی گرفت فرش پر مضبوط نہ تھی۔ دل میں گھبراہٹ، ذہن میں پریشانی، عجیب عالم تھا بے چارے کا۔

بس نے کوئی طویل موڑ لیا اور اس نے اس ڈر سے کہ کہیں سیٹ پر بیٹھے ہوئے لوگوں پر نہ جا گرے۔ دونوں ہاتھوں سے ڈنڈے کو مضبوطی سے جکڑا۔ پھر بھی سیٹ پر بیٹھی ہوئی لڑکی کے ننگے بازو سے اس کی ٹانگیں ٹکرا ہی گئیں۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ پیچھے سے کسی نے زور کا دھکا دیا۔

''سنبھل کر کھڑے ہوئیے صاحب..... پاؤں کچل دیا۔''

اس نے مڑ کر پاؤں کچلے جانے والے کو نہ دیکھا یا یوں کہئے کہ ہمت نہ ہوئی۔ اس کے لئے بڑی مصیبت تھی۔ پیچھے ہٹنے کی جگہ نہ تھی۔ اور نہ آگے بڑھنے کی گنجائش۔

وہ لڑکی سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔ ناحق وہ اس پر گر گیا تھا۔ پتہ نہیں لڑکی کیا سوچتی ہو گی۔ سمجھ رہی ہو گی کہ وہ جان کر اس پر گرا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ معافی مانگنے کا موڈ بناتا، ایک اور جھٹکا لگا

urdunovelist.blogspot.com

اور اپنے آپ کو سنبھالتے سنبھالتے اس لڑکی کا ننگا بازو اس کی ٹانگوں کے درمیان آ گیا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹنا چاہتا تھا، لیکن پیچھے سے متواتر لوگوں نے دھکا دینا شروع کر دیا۔ کوئی اسٹاپ آیا تھا۔ لوگ جلدی جلدی بس سے اُترنا چاہتے تھے اور وہ جلدی سے سیدھا کھڑا ہونا چاہتا تھا لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ تقریباً ایک منٹ تک لڑکی کا گرم بازو اس کی ٹانگوں کو سینک دیتا رہا۔ پھر لڑکی کسمسائی، اسے دیکھا..... بس یونہی..... اور ذرا سا پیچھے کھسک گئی۔

ایک منٹ میں ہی اس کی بری حالت ہو گئی تھی۔ اب وہ لڑکی سے معافی مانگنے کے بجائے کسی طویل موڑ کا منتظر تھا۔ خوش قسمتی سے جلد ہی ایک موڑ بھی آ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی ٹانگوں کے درمیان بازو بھی۔ اس کے پورے جسم میں لہریں سی دوڑ گئیں۔ نسوں میں خون بھرنے لگا۔ اس نے ایک ہلکا سا دباؤ لڑکی پر ڈالا اور ردِعمل دیکھنے لگا..... لڑکی نے گود میں رکھی ہوئی کتابوں کو سنبھالا اور پھر ذرا سا پیچھے کھسک گئی۔ نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ اس نے یہ دیکھنے کے لئے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ اس پر کوئی نظر تو نہیں رکھے ہوئے۔ پھر اس نے ذرا سا ترچھا ہو کر اپنے پیچھے والوں کو دیکھا۔ پیچھے ایک لڑکی کو تین لڑکے گھیرے کھڑے تھے۔ وہ تینوں دوست معلوم ہوتے تھے۔

لڑکی ایک ہاتھ سے سیٹ کے اوپر والے ڈنڈے کو پکڑے کھڑی تھی اور دوسرے ہاتھ میں کتابیں تھیں جو سینے سے لگی ہوئی تھیں۔ انہی میں سے ایک لڑکا جو شکل کا اچھا تھا۔ اس لڑکی سے سٹا ہوا کھڑا تھا۔ لڑکی تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے اِدھر اُدھر ہو جاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لڑکا بھی ایسا ہی کرتا تھا اور اس کے دونوں دوست اس لڑکے کا پردہ بنے کھڑے تھے۔

اسے یہ منظر دیکھ کر بڑا غصہ آیا۔ پھر اچانک بس میں کھلبلی سی مچی۔ شاید کوئی اسٹاپ آ رہا تھا۔ لوگ سیٹوں سے اُٹھ رہے تھے اور خالی جگہوں پر بیٹھنے کے لئے لوگ گدھ کی طرح جھپٹ رہے تھے۔

پھر اس نے دیکھا کہ لڑکا لڑکی کی کمر کے اوپر ہاتھ اُٹھائے کھڑا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے۔ جب بس اسٹاپ آتا ہے تو ایک افراتفری کا عالم ہوتا ہے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہتا۔ ایسے میں جو کچھ نہ ہو جائے کم ہے..... معلوم نہیں، ایک دم جذبہ ہمدردی اس میں کہاں سے عود کر آیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لڑکا کسی قسم کی بدتمیزی نہ کر پائے۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ اس حمام میں خود بھی ننگا تھا۔ اب کیونکہ اس نے کپڑے پہن لئے تھے۔ اس لئے دوسروں کو

ننگا دیکھ کر جلنے لگا تھا..... اس نے بہت سوچ بچار کے بعد پانسہ پھینکا۔ لڑکے کے کان میں آہستہ سے انگریزی میں کہا۔ ”یہ میری بہن ہے۔“

لڑکے پر اس جملے کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ سٹپٹا سا گیا۔ بس اسٹاپ کے آتے ہی ایسا رفو چکر ہوا کہ دیکھتے ہی بنتی تھی۔ لڑکی نے شاید اس کا جملہ سن لیا تھا۔ اسی لئے اس نے بڑے عجیب سے انداز میں اس کو دیکھا تھا۔

وہ لڑکی کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا۔ جیسے دکھانا چاہتا ہو کہ میں نے کوئی ایسا بڑا کارنامہ نہیں کیا۔

پھر کشمیری گیٹ آیا۔ بس جھٹکے کے ساتھ رُکی اور اس نے بہت قریب سے ایک آواز سنی۔

”تھینک کیو برودر۔“

وہ ایک لمحے کے لئے مسکرایا اور اس لڑکی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

”ارے۔“ پھر وہ چونکا۔

یہ لڑکی کیا کہہ کر گئی ہے۔

تھینک کیو برودر نا..... ہاں تھینک کیو برودر ہی..... لیکن اس کا لہجہ..... لہجہ ایسا تھا۔ جیسے کہہ کر گئی ہو۔ ”آپ کون خواہ مخواہ۔“

ان لفظوں کا کیا بھروسہ..... (الفاظ تو لہجے کے غلام ہوتے ہیں)

الفاظ کچھ..... معنی کچھ۔

”تھینک کیو برودر“..... ”آپ کون خواہ مخواہ۔“

”چلو بھئی دریا گنج والو پیچھے آ جاؤ۔“ بس لال قلعے سے آگے، ایڈورڈ پاک سے بھی آگے، دریا گنج میں داخل ہو چکی تھی۔ اسے لال قلعے پر اُترنا تھا۔

”تھینک کیو برودر۔“..... ”آپ کون خواہ مخواہ۔“

”دریا گنج..... دریا گنج..... دریا گنج۔“ □□

urdunovelist.blogspot.com

پھڑ پھڑاتے پَر

''ذرا ماچس دیجئے۔''

کسی نے سریلی آواز میں کہا اور ان کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھ دیا۔ ہاتھ کیا رکھ دیا۔ بلکہ اس کا وزن ان کے کندھے پر لاد دیا۔

انہوں نے مڑ کر دیکھا تو ہاتھ سے ہندی کا ماہنامہ ''ساریکا'' کانپ کر نیچے جا گرا ان کے سامنے ایک لحیم شحیم آدمی کھڑا تھا۔ سب سے پہلے ان کی نظر اس کے یہ لمبے چوڑے سینے پر گئی۔ اتنا بڑا سینہ، انہوں نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ اتنا بڑا سینہ کہ اگر چار آدمیوں کے برابر کھڑا کر دیا جائے تو بنے۔ اس کا چہرہ دیکھنے کے لئے انہیں اپنی گردن اور آنکھیں اُٹھانی پڑیں۔ اگرچہ وہ خود بھی پونے چھ فٹ کے آدمی تھے لیکن ان کا سر اس کے شانے تک لگتا تھا۔ چہرے پر نظر پڑی تو انہیں اپنے جسم میں خوف کی لہر، لہراتی ہوئی نظر آئی۔

لال آنکھیں جیسے شعلے ناچ رہے ہوں۔ یا دوزخ کی دو کھڑکیاں کھلی ہوں۔ ناک اتنی لمبی، موٹی اور چوڑی جیسے بھینس کے نتھنے یا دو شہنائیوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا ہو۔ منہ اتنا بڑا جیسے توپ کا دہانہ۔ اوپر کا ہونٹ اتنا باریک جیسے سرمہ لگانے کی سلائی، نیچے کا ہونٹ موٹا اور لٹکا ہوا جیسے جلے ہوئے گوشت کی بوٹی۔ منہ میں ایک دانت نہیں۔ چہرے پر لاتعداد ننھے ننھے اُبھار جیسے گرمی

دانے نکل آئے ہوں۔ رنگ زرد، بالکل زرد، جیسے سیکڑوں جونکوں نے خون چوس لیا ہو۔ گردن لمبی اور پتلی اور اس پر سفید سفید دھاریاں، سر اتنا بڑا، اتنا بڑا..... کہ بس۔

غرض ان کے سامنے ایک ایسا خوفناک آدمی کھڑا تھا۔ آدمی کیا دیو کھڑا تھا۔ جس کے چہرے سے ہیبت اور خباثت ٹپک رہی تھی۔ اگر مضبوط سے مضبوط دل والا نوجوان اسے اندھیرے میں دیکھ لے تو کلیجہ پھٹ جائے۔

''ذرا ماچس دیجئے۔'' ایک بار پھر خوفناک چہرے نے اپنی انگلیوں میں پھنسی سگریٹ کو ہلاتے ہوئے کہا۔ سگریٹ انگوٹھے سے موٹی اور پنسل کے برابر لمبی تھی۔ لیکن آواز اتنی باریک، سریلی اور لچکیلی تھی جیسے کوئی سولہ سالہ حسینہ چہک رہی ہو۔

''جج..... جی..... نہیں ہے ماچس۔'' وہ بمشکل ہکلائے۔

''آپ سگریٹ پیتے ہیں۔'' توپ کے دہانے سے سریلی آواز برآمد ہوئی۔

وہ ان لوگوں میں سے تھے جو سگریٹ تو پیتے ہیں لیکن ماچس پاس نہیں رکھتے۔

''جی، ہاں۔''

''پھر آپ کو ماچس رکھنی چاہئے۔'' اُس نے ایک بار پھر بڑی شفقت سے دس کلو وزن ان کے کندھے پر رکھ دیا۔ اور اپنی آگ بھری آنکھیں ان کی برف سے بھی ٹھنڈی آنکھوں سے ٹکرا دیں۔ دہکتے شعلوں کا برف تاب نہ لا سکی اور پگھل گئی۔ ان کی آنکھیں جھک گئیں جب انہوں نے آنکھیں اُٹھائیں تو وہ ان کے سامنے نہیں تھا۔ انہوں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ وہ اسے جاتے دیکھتے رہے۔

اس وقت پلیٹ فارم بالکل سونا پڑا تھا کیونکہ کسی گاڑی کے آنے کا وقت نہیں تھا اور علیگڑھ اسٹیشن یوں بھی سنسان پڑا رہتا ہے کیونکہ یہاں سے آنے جانے والی گاڑیوں کی تعداد زیادہ نہیں۔

ریلوے بک اسٹال پر اس وقت وہ اکیلے کھڑے تھے۔ جب بک اسٹال والے شرما نے انہیں اس طرح سکتے میں کھڑا دیکھا تو اس نے ان کے شانے ہلائے۔

''کیا بات ہے صاحب۔''

وہ چونکے، مڑ کر جب انہوں نے اسٹال کے مالک شرما جی کا چہرہ دیکھا تو وہاں انہیں خوف و

urdunovelist.blogspot.com

ہراس کے تاثرات نہیں ملے۔ شرما کا چہرہ سپاٹ تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔

''ابھی آپ کس سے باتیں کر رہے تھے۔''

''کیا تم نے نہیں دیکھا؟''

''یہاں کوئی ہوتا تو دیکھتا آپ تو خود بخود ہی کچھ بڑبڑا رہے تھے۔''

''کیا؟..... تم نے اس دیو کو نہیں دیکھا جس نے مجھ سے ماچس مانگی تھی..... اس کا خوفناک چہرہ..... وہ ابھی ابھی گیٹ سے باہر نکل کر گیا ہے۔''

''کیوں مذاق کرتے ہیں رشید صاحب۔''

اور پھر رشید صاحب نے لاکھ یقین دلایا کہ ایسے ایسے ایک لمبے چوڑے آدمی نے مجھ سے ماچس مانگی تھی۔ اس کا ایسا خوفناک چہرہ تھا لیکن شرما نے اقرار کر کے نہیں دیا کہ ہاں اس نے کوئی خوفناک چہرہ دیکھا تھا۔ وہ اقرار کرتا بھی کیسے اس نے دیکھا کب تھا۔

رشید صاحب کا معمول تھا کہ وہ روز اسٹیشن آتے ریلوے بک اسٹال پر چند رسائل اور کتابوں کی ورق گردانی کرتے۔ ایک دو نئے رسالے خریدتے اور پھر چل دیتے مولانا آزاد لائبریری کی طرف۔ وہاں کے کیفے ٹیریا میں چائے پیتے چند ادیبوں شاعروں سے باتیں کرتے اور پھر رسل گنج اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتے۔ مگر آج نہ جانے کون سا منحوس دن تھا کہ پہلی منزل پر ہی اس لمبے چوڑے انسان سے مڈبھیڑ ہو گئی..... کیسا خوفناک آدمی تھا وہ..... اس کا خیال آتے ہی کپکپی سی دوڑ گئی۔ حواس درست ہوئے تو سگریٹ کی طلب بڑھی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا سگریٹ نہیں تھی۔ ایک خوانچے والے سے ''چار مینار'' کا ایک پیکٹ خریدا۔ سگریٹ نکالی، ڈبیا پر ٹھونکی اور منہ میں لگا لی۔ خوانچے والے کی طرف ہتھیلی پر انگلیاں رگڑ کر ماچس کے لئے اشارہ کیا۔ سگریٹ سلگا کر ماچس دیتے ہوئے بولے۔ ''کیوں بھئی، تم نے کسی آدمی کو اِدھر سے گزرتے ہوئے تو نہیں دیکھا۔''

''کون آدمی ساب۔''

''ارے ایک بہت لمبا چوڑا آدمی تھا۔ مجھ سے دُگنا لمبا، سر پہاڑ، گردن پتلی، پیلا رنگ۔''

''نہیں ساب..... میں نے کوئی آدمی ایسا نہیں دیکھا۔''

اس جواب نے ان پر اور خوف طاری کر دیا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے گیٹ سے

باہر نکلے۔

آخر وہ کیا بلا تھی۔ جو صرف مجھے ہی نظر آئی۔ مجھ سے ہی اُس نے ماچس مانگی۔ کم بخت کو کوئی اور ماچس دینے والا نہ ملا۔ کہیں کوئی بھوت ووت تو نہیں تھا۔ ہشت بھوت ووت کوئی چیز نہیں۔ مجھے بھوت پریت پر یقین نہیں۔ تو پھر وہم ہوگا۔ وہم ہرگز نہیں اس نے مجھ سے ماچس مانگی تھی۔ اس کی سریلی آواز اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے اور وہ اس کا میرے کندھے پر ہاتھ رکھنا۔ اُف توبہ کتنا وزنی تھا وہ ہاتھ۔ اب تک میرے کندھے اس کے ہاتھ کا بوجھ محسوس کر رہے ہیں تو پھر یہ سب کچھ وہم کیسے ہو سکتا ہے۔

سگریٹ ختم ہو چکی تھی۔ وہ گھنٹہ گھر سے آگے طبیہ کالج کے اسپتال کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ سڑک تقریباً سنسان تھی۔

کھمبوں پر لگے ہوئے بلب لالٹین کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔ دوسری سگریٹ انہوں نے ہونٹوں میں دبالی لیکن ماچس تھی نہیں۔ ماچس وہ کبھی نہ رکھتے تھے کون خواہ مخواہ جیب کا بوجھ بڑھائے۔ دور تک کوئی سگریٹ والا نظر نہیں آ رہا تھا جس سے وہ اپنی سگریٹ سلگاتے۔ سگریٹ پھینکنے کا انہیں افسوس تھا اگر وہ اس سے ہی دوسری سگریٹ سلگا لیتے تو اب پریشان نہ ہونا پڑتا۔

ان جلی سگریٹ کا انہوں نے ایک کش لیا اور آگے بڑھتے رہے اس اُمید پر کہ کوئی سگریٹ والا نظر آئے۔

لال ڈگی آنے کو تھی مگر کوئی سگریٹ والا نہ ملا تھا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اب سے کچھ سال پہلے (شاید اب بھی) لال ڈگی جن بھوتوں، ننوں کا مسکن تھی۔ جو بارہ بجے کے بعد سڑک پر چلنے والے راہ گیروں کو پریشان کرتے تھے۔

''کتنے بے وقوف ہیں لوگ۔'' انہوں نے سوچا۔

اور جیسے ہی نظر اُٹھائی تو انہوں نے دیکھا کہ لال ڈگی کے تراہے کے بیچوں بیچ کوئی لمبا چوڑا آدمی کھڑا ہے۔ اس کے منہ میں سگریٹ لگی ہوئی ہے وہ ان سے صرف دس قدم کے فاصلے پر تھا۔

اسے دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئے۔ ان کو رُکتا دیکھ کر اس نے دو قدم بڑھائے اور اس کے قریب آ گیا۔ ان جلی سگریٹ اب بھی رشید صاحب کے منہ میں لگی ہوئی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔

urdunovelist.blogspot.com

"لیجیے سگریٹ جلایئے۔" وہی سریلی آواز۔

فضا میں تیلی رگڑنے کی آواز پیدا ہوئی۔ ایک شعلہ چمکا اور ان کی سگریٹ سلگنے لگی۔ سگریٹ سلگتے ہی اُس نے کہا۔

"اچھا اجازت۔" اور وہ غائب ہو گیا۔

رشید صاحب کے چہرے پر پسینے کی ہزاروں بوندیں اُبھر آئی تھیں۔ پاؤں وزنی ہو گئے تھے۔ سلگی ہوئی سگریٹ ہونٹوں میں دبی تھی وہ کانپ رہی تھی۔ کانوں میں "طوفان میل" کی سیٹیاں بج رہی تھیں۔ دل میں جہاز کی "گھڑ گھڑاہٹ" تھی۔

"رکشا چاہئے صاحب۔"

ایک رکشے والے نے انہیں یوں کھڑا دیکھا تو سمجھا کہ کسی رکشے کا انتظار ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملا۔ وہ رکشے میں سوار ہوئے اور پھنسی آواز میں بولے۔ "رسل گنج۔"

دس منٹ بعد رکشہ رسل گنج میں داخل ہوا۔ پل سے نیچے اترتے ہی انہوں نے رکشہ رکوا لیا۔ اگرچہ ابھی گھر دور تھا لیکن کوئی خاص دور نہیں۔ یہی دو سو تین سو قدم دور۔ رکنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ چائے پینا چاہتے تھے اور رسل گنج میں سب سے اچھی چائے "آنند ہوٹل" میں ہی ملتی ہے۔ یہ "ہوٹل" لکڑی کے بڑے سے کیبن میں واقع تھا۔ مشکل سے بیس پچیس آدمیوں کے بیٹھنے کا انتظام ہے لیکن صاف ستھرا ہے۔

رکشہ والے کو ایک روپے کا نوٹ دیا۔ اُس نے بارہ آنے واپس کرنے چاہے مگر رشید صاحب اس وقت تک چائے خانے میں داخل ہو چکے تھے۔

رکشہ والا خوشی خوشی ریلوے روڈ کی طرف چلا گیا۔

کونے والی میز خالی تھی۔ وہ بیٹھے۔ پرتاپ آیا۔

"کیا چاہئے صاحب۔"

"چائے لاؤ۔"

آرڈر دے کر انہوں نے اپنے بائیں طرف والی میز کی طرف دیکھا۔ پانچ چھ نوجوان بیٹھے دلیپ کمار کی اداکاری پر بحث کر رہے تھے۔ میز پر چائے کی پیالیوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ انہیں

اخبار کی تلاش تھی اور جس اخبار کی تلاش تھی۔ اسے ایک آدمی پڑھ رہا تھا جو سامنے والی میز پر براجمان تھا اس کا چہرہ اخبار میں ڈوبا ہوا تھا۔

اچانک اس نے اپنے چہرے سے اخبار ہٹایا اور ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

رشید صاحب پر بجلی سی گری۔ وہ اُٹھے، کرسی میں پاؤں اُلجھا۔ اوندھے منہ جا گرے۔ لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ پھر اُٹھے اور تیزی سے چائے خانے سے نکل کر گھر کی طرف بھاگے۔

☆......☆......☆

رات کے پونے تین بج رہے ہیں۔

رات سرد ہے اور ڈراؤنی بھی اور رشید صاحب اپنے کمرے میں تنہا سو رہے ہیں، کمرے میں اندھیرا ہے۔ انہیں اندھیرے میں ہی نیند آتی ہے، اس لئے بلب روشن نہیں۔

کمرے کا ایک ایک سوراخ بند ہے، شاید ہوا کی وجہ سے یا ڈر کی وجہ سے۔ رشید صاحب کو سوتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی کہ انہیں محسوس ہوا جیسے کوئی ان کے پاؤں کے انگوٹھے پکڑ کر ہلا رہا ہو۔

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ تب ہی خود بخود بلب روشن ہو گیا۔ اُن کے سامنے وہی لمبا چوڑا آدمی کھڑا تھا۔ جس کا سر چھت کو چھو رہا تھا۔

وہ فوراً لحاف میں غروب ہو گئے اور وہیں سے آہستہ سے بولے۔ "آخر تم کون ہو......؟"

خوفناک آدمی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اُبھری۔ اس نے جیب سے ایک کارڈ نکالا جس پر سنہرے حرفوں میں کچھ لکھا تھا۔ پھر اس نے دوسری جیب سے دوسرا کارڈ نکالا۔ اس پر سنہری حرفوں میں رشید صاحب کا نام، پیشہ، حلیہ لکھا تھا اور اس کے ساتھ ہی وقت تین بجے، دن جمعہ، تاریخ انیس، مہینہ جون اور سال 1967ء درج تھا۔ اس نے اس کارڈ کو دیکھ کر جیب میں رکھ لیا اور پہلے والے کو ہاتھ میں لے لیا۔ دیوار سے چپکی گھڑی کو دیکھا۔ تین بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔

"خدا کے واسطے بولو......تم کون ہو، مجھ سے کیا چاہتے ہو......" لحاف میں کلبلاہٹ محسوس ہوئی۔

تب ہی گھڑی نے تین بجائے۔

urdunovelist.blogspot.com

اس نے ہاتھ بڑھا کر، لحاف کو ان سے الگ کر دیا اور ان کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے کارڈ رکھ دیا۔ کارڈ دیکھتے ہی اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور جسم سرد ہو گیا۔

لمبے چوڑے انسان نے ان کی لاش کو لحاف سے ڈھک دیا اور اس کارڈ کو دیکھتا ہوا اوپر کی طرف پرواز کر گیا جس پر لکھا تھا۔ ''ملک الموت۔'' □□

شوقِ دید

ہوٹل میں داخل ہوتے ہی اس نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ مقصد صرف خالی میز تلاش کرنا نہ تھا بلکہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لینا بھی تھا۔ پھر وہ بڑی خود اعتمادی سے چلتا ہوا ایک اور خالی میز کے پاس پہنچا۔ ہاتھ میں دبی ہوئی بڑی سی ٹارچ قطب مینار کی طرح میز پر کھڑی کی، بغل سے موٹا سا رول کھینچ کر ٹارچ کے برابر رکھا پھر کانوں سے مفلر کھولتا ہوا کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ میز پر پڑا ہوا اخبار بڑی محویت سے پڑھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں بیرا اس کے سامنے چائے سے بھری کیتلی اور ایک کپ رکھ گیا۔ اس نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر کیتلی کو پکڑا اور کپ میں چائے انڈیلنے لگا۔ چائے انڈیلتے انڈیلتے اس نے ترچھی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں اُسے مسلسل گھور رہا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی میں نے نظریں بچالیں اور اپنے دوستوں کو کوئی لطیفہ سنانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی بات تھی کہ میں نے دوبارہ اس کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کی۔

چائے کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لینے کے بعد اس نے ایک لمحہ ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اوور کوٹ کا کالر کھڑا کرتا ہوا اُٹھ گیا اور بھاری بوٹوں کی دھم دھم میرے کان میں گونجنے لگی۔ اس کے ہوٹل سے نکلتے ہی ہم کھڑے ہو گئے۔ چائے کے پیسے دیتے ہوئے میرے ایک دوست نے ہوٹل

urdunovelist.blogspot.com

کے مالک سے پوچھا۔ ''آنند..... یہ آدمی کون ہے؟''

بھاری چہرے والے آنند نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ حسبِ عادت اس نے کچھ سوچا پھر دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مجھے نہیں معلوم صاحب! یہ کون ہے! اسی سے کچھ پوچھئے وہی اگر اپنے بارے میں کچھ بتا سکے تو بتا سکے۔''

''سی آئی ڈی کا ہے؟'' میرے دوست نے آنند کو کریدا۔

''بھگوان جانے۔'' آنند نے باقی پیسے واپس کرتے ہوئے کہا۔ ہم آنند سے واقف تھے۔ اس سے کچھ معلوم کر لینا آسان نہیں تھا۔ ہم جلدی سے ہوٹل سے باہر نکلے۔

''کدھر گیا؟'' میرے دوست رشید نے پوچھا۔

''وہ جا رہا ہے سامنے بڑے پل پر!'' میں نے بتایا۔

''آؤ پھر!'' طاہر نے کہا۔

ہم تینوں نے بڑے پل پر جانے کی بجائے چھوٹے پل والا راستہ اختیار کیا کیونکہ بڑا پل ایک لمبا چکر کاٹ کر سیڑھیوں سے آملتا تھا۔ بڑا پل عبور کرنے کے بعد اُس نے گھنٹہ گھر جانے والی سڑک پکڑ لی۔ ہم بڑی مستعدی اور ہوشیاری سے اُس کا تعاقب کر رہے تھے۔ گورنمنٹ پریس کے سامنے وہ اچانک نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دور تک سیدھی سڑک تھی۔ کوئی موڑ، کوئی چوراہا یا دوراہا نہ تھا۔ وہ ہماری نظروں میں تھا کہ پلک جھپکتے ہی وہ سڑک سے غائب ہو گیا اور ہم تینوں باوجود کوشش کے اُسے تلاش نہ کر سکے۔

ہم مایوس اور حیرت زدہ سے واپس ہوٹل لوٹ آئے اور اس پراسرار آدمی کے بارے میں نئے سرے سے غور کرنے لگے۔ وہ سی آئی ڈی کا آدمی تھا یا ریلوے کا کوئی ملازم۔ پولیس کانسٹیبل تھا یا کوئی آوارہ گرد آدمی۔ ہمیں اب تک کچھ معلوم نہ ہو سکا تھا۔ یہی اجنبیت تھی جو ہمیں بار بار اس کی طرف کھینچتی تھی۔ میں نے اور میرے دوستوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اس آدمی کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ معلوم کر کے رہیں گے۔ وہ کون ہے؟ ایسی سخت سردی میں روز کہاں جاتا ہے؟

دوسرے دن ہم نے ہوٹل کے تمام اخبارات اپنی میز پر جمع کر لئے اور اس کا انتظار کرنے لگے۔ اب تک ہم اس پراسرار آدمی کی آواز نہ سن سکے تھے۔ وہ ہوٹل میں کسی سے بات کرتا ہی نہ

تھا۔ حتیٰ کہ میں نے اُسے چائے کا آرڈر دیتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ خاموشی سے آتا، تھوڑی دیر میں خود بخود چائے سے بھری کیتلی اس کے سامنے آجاتی، چائے پیتے ہوئے وہ بڑے انہماک سے اخبار پڑھتا اور چائے ختم ہوتے ہی کھڑا ہو جاتا۔ کاؤنٹر پر خاموشی سے پیسے ادا کرتا اور ہوٹل سے نکل جاتا لیکن آج ہم نے ایسی ترکیب کی تھی کہ اسے بولنا ہی پڑے۔ ہوٹل میں آنے والے سارے اخبارات ہماری میز پر تھے ہم نے اخبار کے بغیر اسے کبھی چائے پیتے نہیں دیکھا تھا۔

وہ اپنے وقت پر ہوٹل میں داخل ہوا اور ہمارے برابر والی خالی میز پر بیٹھ گیا۔ اپنی ''زین'' کھول کر اس نے اخبار کیلئے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ ہم ہاتھوں میں اخبار لئے بڑے انہماک سے پڑھنے میں مشغول تھے۔ باقی اخبارات کے صفحے ہم نے اپنی کہنیوں سے دبائے ہوئے تھے اس نے ایک سرسری نظر ہماری میز پر ڈالی۔ میں نے سوچا کہ وہ اب ہم سے اخبار مانگے گا اور اس طرح کچھ راہ و رسم پیدا کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ لیکن وہ ہمارے بچھائے ہوئے جال میں پھنسنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے کیتلی سے چائے انڈیل انڈیل کر پیتا رہا اور لمبی سی ٹارچ اس کے کھردرے ہاتھوں میں جلتی بجھتی رہی۔

چائے پی کر وہ جیسے ہی باہر نکلا۔ میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ اس کے تعاقب میں چل پڑا۔ اس نے پھر بڑے پل والا راستہ اختیار کیا۔ ہم نے آج چھوٹے پل کی بجائے اس کے ساتھ چلنا ہی مناسب سمجھا اور کوشش یہ رہی کہ ہمارے درمیان فاصلہ زیادہ نہ ہونے پائے۔ کل فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

پل سے اترتے ہی اس کی چال میں تیزی آگئی۔ شاید اسے تعاقب کئے جانے کا احساس ہو گیا تھا۔ ہم نے بھی اپنے قدم تیز کر دیئے۔ گورنمنٹ پریس کے سامنے پھر کل جیسا واقعہ پیش آیا۔ اچانک وہ چلتے چلتے غائب ہو گیا لیکن فاصلہ کم ہونے کی وجہ سے ہم نے اسے سڑک کے کنارے بنے، چھوٹے سے خشک نالے میں بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا وہ بلے کی طرح جست لگا کر نالے سے نکلا اور چرچ کی دیوار پھاند کر درختوں میں غائب ہو گیا۔ میں نے اور طاہر نے تو اسے چرچ کی دیوار پھلانگتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن رشید نے صرف اسے نالے میں بیٹھتے ہوئے ہی دیکھا تھا۔ اسے

urdunovelist.blogspot.com

یقین نہ تھا کہ وہ دیوار پھلانگ کر درختوں میں گم ہو گیا ہے۔ ہم سڑک پر کھڑے ہوئے پہلے تو یہی سوچتے رہے کہ اب کیا کریں۔ چرچ کی دیوار پھلانگ کر اسے اتنے گہرے اندھیرے میں تلاش کر لینا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ ہم واپسی کی سوچ ہی رہے تھے کہ رشید کو دیوار سے جھانکنے کی سوجھی۔ ہم دونوں سڑک پر کھڑے رہے۔ رشید نالا پار کر کے جیسے ہی دیوار پر چڑھا ایک تیز روشنی اُس کے منہ پر پڑی اور ساتھ ہی انتہائی غصیلی آواز سنائی دی۔

''کیا ہے؟''

پھر وہ اُچھل کر دیوار پر چڑھ آیا۔ اس نے ہمارے چہروں پر لائٹ ڈالی اور سخت لہجے میں بولا۔

''خدا کیلئے آپ لوگ میرا پیچھا چھوڑ دیں!''

میں نے فوراً ہی رشید کو آواز دے لی۔ خواہ مخواہ جھگڑا بڑھانے سے فائدہ۔ آج کے دن اتنا ہی کافی تھا۔ کم از کم ہمارا تعاقب تو کامیاب ہو گیا تھا۔

وہ کئی دن تک ہوٹل میں نظر نہیں آیا۔ تین چار روز تو ہم اس کا ذکر کرتے رہے جب وہ ایک ہفتے تک کہیں نظر نہ آیا تو ہم اسے بھولنے لگے۔ ایک دن آنند نے ہمیں ہوٹل سے نکلتے ہوئے روک لیا۔ ''آج وہ آپ لوگوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔'' اس نے بتایا۔

''کیا پوچھ رہا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہی کہ آپ لوگ کون ہیں۔ کہاں رہتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں!''

''اچھا! لو بھئی طاہر! یہ تو معاملہ ہی اُلٹا ہو گیا۔ اب تک تو ہم اس کے بارے میں پوچھتے پھرتے تھے۔ اب اس ظالم نے ہمارے بارے میں تحقیقات شروع کر دی۔'' میں نے طاہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا پھر آنند سے مخاطب ہوا۔ ''اس سے کہاں ملاقات ہوئی؟''

''یہیں ہوٹل میں۔'' آنند نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دراصل اب وہ اس وقت آتا ہے جب آپ لوگ چلے جاتے ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ آج رات ہم اس کا انتظار کریں گے۔'' رشید نے کہا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم سب پھر آنند ہوٹل میں اکٹھا ہوئے۔ طاہر اور رشید کے علاوہ محلے کے کچھ اور ساتھی بھی جمع ہو گئے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ آج اس سے ہر قیمت پر بات کی جائے۔

اس بات سے سب ہی متفق تھے لیکن بلے کے گلے میں گھنٹی باندھنے سے ہر آدمی کترا رہا تھا۔ اس کے ساتھ مذاکرات کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ پھر قرعہ فال میرے نام نکلا۔ یار لوگوں نے کچھ جھوٹی سچی تعریفیں کر کے مجھے اس کے گلے میں گھنٹی باندھنے کے لئے آمادہ کر لیا۔ ویسے میں خود بھی اس سے بات کرنے کے لئے بے تاب تھا اور جلد سے جلد اس کی شخصیت سے نقاب اُٹھتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔

خاصے انتظار کے بعد وہ ہوٹل میں داخل ہوا۔ ہوٹل میں ہمارے سوا کوئی اور نہ تھا۔ ایک لمحہ رک کر اس نے واپس جانے کا ارادہ کیا لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ ایک خالی میز کی طرف بڑھا۔ ہوٹل کے سارے اخبار ہماری میز پر تھے۔ صرف ایک بیکار سا صفحہ جس پر ٹینڈر نوٹس اور چھوٹے چھوٹے الا بلا اشتہارات چھپے ہوئے تھے، اس کی میز پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

اس نے ٹارچ اور رول رکھنے کے بعد، کانوں سے مفلر کھول کر خالی میزوں پر نظر دوڑائیں پھر مایوس ہو کر اسی صفحے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

''اخبار چاہئے!'' میں نے اپنی کرسی سے بغیر اُٹھے اسے مخاطب کیا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ زبان سے کچھ نہ بولا۔ میں نے میز سے سارے اخبارات اکٹھا کئے اور اس کی خدمت میں بڑے ادب سے پیش کر دیئے۔

''شکریہ!'' یہ کہہ کر وہ اخبارات پر اس طرح ٹوٹ پڑا جیسے کوئی بھوکا بلا دودھ دیکھ کر جھپٹ پڑے۔ میں اپنی میز پر واپس چلا آیا۔

''اب جاؤ۔'' چند ہی لمحے بعد طاہر نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے اس کی میز پر جانے کا اشارہ کیا۔

''ابھی نہیں! ذرا ٹھہر جاؤ! پہلے اسے تھوڑا سا اخبار چاٹ لینے دو۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

تھوڑی دیر میں کیتلی اور کپ بھی اس کے سامنے پہنچ گئے۔ اب کے رشید نے کہنی ماری۔

''چائے پینے کے بعد یہ ایک منٹ بھی یہاں نہیں ٹھہرے گا۔ اگر جانا ہے تو ابھی چلے جاؤ۔''

میں نے رشید سے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ ''ذرا صبر کرو۔''

جب اس نے تیسری بار کپ بھرنا شروع کیا تو میں بڑی لاپروائی سے اپنی میز سے اُٹھ کر اس کی میز کی طرف چلا گیا۔ میں کھڑا ہو کر اخبارات کے ڈھیر میں سے کوئی مخصوص صفحہ تلاش کرنے لگا۔

urdunovelist.blogspot.com

پھر جب وہ صفحہ مل گیا تو میں نے وہیں کھڑے کھڑے پڑھنا شروع کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے کھڑا دیکھ کر بیٹھنے کی پیشکش ضرور کرے گا لیکن میرے دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی اور مجھے مجبوراً چکنا گھڑا بننا پڑا۔

''میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔

''جی تشریف رکھئے!'' وہ اس طرح بولا جیسے اس نے یہ الفاظ ادا کرنے کیلئے اپنے دل پر جبر کیا ہو۔

میرے بیٹھتے ہی اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں اس کی نظروں کی پروا نہ کرتے ہوئے اخباروں کو یوں ہی اُلٹنے پلٹنے لگا۔

''جی فرمایئے!'' آخر اس کی نظروں کا سوال اس کی زبان پر آ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ گفتگو کا آغاز کس طرح کروں۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنے بارے میں کچھ عقدہ کشائی کرے اور اسے گفتگو پر آمادہ کرنے کیلئے کسی مناسب جملے کی ضرورت تھی۔

''یوں تو کوئی ایسی خاص بات نہیں۔'' میں نے اخبار کی سرخی پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''بس آپ سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔''

''جی فرمائیں! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' اس کے لہجے میں شائستگی تھی۔

میں نے مختصراً اپنا تعارف کرایا۔ پھر اس کا نام پوچھا۔

''میرا نام وقار علی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں یونیورسٹی میں ہیڈ کلرک ہوں۔''

''آپ کی ٹارچ خاصی پاور فل ہے۔'' میں اسے لائن پر لانا چاہتا تھا۔

''جی ہاں! یہ بارہ سیل کی ہے۔ علی گڑھ میں ایسی ٹارچ کسی کے پاس نہیں۔ یہ میں نے بمبئی سے منگوائی تھی۔'' وہ ٹارچ کو جلاتے ہوئے بولا۔

''یہ ڈنڈا بھی بالکل ہیڈ ماسٹروں والا ہے۔''

''میرے پاس ایک چیز اور بھی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ ریوالور نکال رہا ہے لیکن جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں پیتل کے دستے کا کھٹکے سے کھلنے والا ایک خطرناک چاقو تھا۔

''یہ رامپوری چاقو ہے۔ میں نے نمائش سے خریدا تھا۔'' اس نے چاقو کھولتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے چاقو لے کر دھار پر ہاتھ پھیرا پھر احتیاط سے بند کر کے لوٹا دیا۔

''شاندار ہے۔'' میں نے تعریف کی۔

''اس کا کام بھی شاندار ہے۔'' وہ شاید مجھے مرعوب کرنے کی کوشش میں تھا۔

''میں پوچھ سکتا ہوں کہ روز رات کو آپ کہاں جاتے ہیں؟'' میری زبان پر آخر وہ سوال آ ہی گیا جس کے لئے یہ سارا جال بچھایا تھا۔

''میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا لیکن ایک شرط ہے۔'' اس نے کہا۔

''فرمایئے!'' میں بولا۔

''اس کے بعد آپ لوگ میرا پیچھا کرنا چھوڑ دیں گے۔ اس چکر میں میرے دو دن ضائع ہو چکے ہیں۔ آج کا دن بھی گیا۔ آپ لوگ اسی طرح میرے پیچھے پڑے رہے تو میرا بزنس ہی چوپٹ ہو جائے گا۔''

''بزنس؟'' میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بڑبڑایا۔

urdunovelist.blogspot.com

پھر وہ دھیرے دھیرے کھلتا گیا۔ اس کی شخصیت سے پیازی چھلکے اُترتے گئے۔ میں نے اس کے بارے میں سب کچھ جان لیا۔ اس نے جو کچھ بتایا وہ نہ صرف میرے لئے نیا تھا بلکہ میرے دوست بھی علی گڑھ کے ان پوشیدہ گوشوں سے ناواقف تھے۔ گھنٹہ گھر کے نیچے، چرچ کے سائے میں، نقوی پارک کی جھاڑیوں میں اور نہ جانے کہاں کہاں، ایسی سردی میں کیا گل کھلائے جا رہے تھے۔ ہمیں کچھ معلوم نہ تھا۔

وہ عاشقوں کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کا عادی تھا۔ برسوں سے اس کا یہی مشغلہ اور یہی بزنس تھا۔ وہ باغ کے کسی تنہا گوشے میں دُبکے ہوئے رومان زدہ جوڑے کو تلاش کرتا اور خاموشی سے کسی جھاڑی، درخت یا دیوار کی آڑ لے کر کھڑا ہو جاتا، بیٹھ جاتا یا لیٹ جاتا۔ اس کی تیز نظریں جوڑے پر جمی ہوتیں۔ جیسے ہی جوڑا گلے شکوے یا عشقیہ مکالمے دہرا کر عملی میدان میں قدم رکھتا، وقار علی جال بن کر ان پر گرتا۔ بارہ سیل کی ٹارچ شعلے کی طرح ان کے چہروں سے لپٹ جاتی۔ وہ کپڑے درست کرتے ہوئے ہڑبڑا کر اُٹھ جاتے۔ ندامت سے جھکے چہرے، بدنامی کے ڈر سے کانپتی ٹانگیں اور اس وقت وقار علی کے کوٹ سے ایک کاپی اور ایک قلم نکلتا۔ ساتھ ہی رامپوری چاقو کھٹکے

سے کھلتا اور وہ لڑکے کی طرف کاپی قلم بڑھاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہتا۔ ''لکھو! میں فلاں ابن فلاں اس لڑکی کے ساتھ حالتِ وصل میں پکڑا گیا۔ اس کے نیچے اپنے دستخط کرو!''

لڑکا کانپتے ہاتھوں سے لکھتا۔ ''میں واجد احمد ولد شریف حامد، آنسہ جمیلہ ولد سکندر خان کے ساتھ حالتِ وصل میں پکڑا گیا۔'' اس عبارت کے نیچے لڑکے کے ساتھ لڑکی کے بھی دستخط لئے جاتے اور یوں کھیل ختم ہو جاتا۔ بس یہی اس کا بزنس تھا۔ اس بزنس سے اسے پھوٹی کوڑی کی بھی آمدنی نہ تھی، وہ لوگوں کو بلیک میل کرنے کا عادی نہ تھا بلکہ اسے مشکوک جوڑوں کا تعاقب کر کے، جھاڑیوں جھاڑیوں گھوم کر، گھٹنوں کے بل لیٹ کر، لوگوں کو رنگے ہاتھوں پکڑنے میں روپے سے بھی زیادہ لطف آتا تھا۔ اس کے علاوہ جب وہ آدمی کہیں ملتا تو اسے دیکھ کر دور ہی سے اس کی گردن جھک جاتی۔ قریب آتا تو بڑے ادب سے اسے سلام کرتا اور بادشاہ وقار علی کے سامنے سے ایک حقیر رعایا کی طرح گزر جاتا۔ یہی جھکی ہوئی گردن، کسی اچھے اور شریف گھرانے کے فرد کا ادب سے سلام کرنا اور فقیرانہ اس کے سامنے سے گزر جانا ہی اس کے لئے سب سے بڑا انعام تھا۔

ایسی تحریروں کی اس نے ایک فائل بنائی ہوئی تھی۔ جسے وہ ''سرمایۂ حیات'' کہا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اس کا ''سرمایۂ حیات'' دیکھنے کی خواہش ظاہر کی لیکن وہ خوبصورتی سے ٹال گیا۔

''جو دوسروں کے عیب چھپاتا ہے۔ خدا اس کے عیبوں پر پردہ ڈالتا ہے۔'' اس نے کہا۔

میں نے سوچا یہ کتنا عجیب آدمی ہے۔ خود لوگوں کے عیب تلاش کرتا پھرتا ہے۔ انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنے کی فکر میں رہتا ہے لیکن کوئی ہاتھ آ جائے تو اس کا ڈھنڈورا پیٹنے کی بجائے خاموشی اختیار کرتا ہے۔

☆.....☆.....☆

یہ اسی سال کی بات ہے۔ مہینہ مجھے یاد نہیں۔ غالباً مارچ یا اپریل کا واقعہ ہے۔ علی گڑھ میں ہولی پر فرقے وارانہ فسادات پھوٹ پڑا۔ جمعے کا دن تھا اور اسی دن ہولی تھی۔ صبح ہی سے سڑکوں پر رنگ کھیلا جا رہا تھا۔ لوگ کالے پیلے بھوت بنے، ہاتھوں میں پچکاریاں لئے اِدھر سے اُدھر گھوم رہے تھے۔ دوپہر کو ایک مسلمان نمازی پر کسی شریر بچے نے رنگ کی پچکاری ماردی۔ نمازی نے بچے کو پکڑ کر پیٹ دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ آناً فاناً فساد برپا ہو گیا۔ رنگوں کی ہولی خون کی ہولی میں تبدیل ہو گئی۔

خاصا جانی و مالی نقصان ہوا۔

فوری طور پر کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ دونوں طرف سے گرفتاریاں ہوئیں۔ حالات معمول پر آنے کے بعد کرفیو کی مدت کم کر دی گئی۔ اب صرف رات کے وقت کرفیو لگتا تھا۔ سات بجتے ہی شہر میں اُداسی پھیل جاتی۔ سڑکیں، گلیاں، محلے، بازار ویران ہو جاتے۔ ہر شخص اپنے گھر بیٹھنے پر مجبور تھا۔

اس کرفیو کے ہاتھوں ہم بہت تنگ تھے۔ کیونکہ ہماری نشست ختم ہو گئی تھی۔ ہم رات گئے تک ہوٹل میں بیٹھنے کے عادی تھے۔ اب سات بجے سے پہلے ہی گھروں کا رُخ کرنا پڑتا تھا۔ وقار علی بھی ان دنوں بہت پریشان تھا۔ کرفیو لگے ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے اور اس کے جلد کھلنے کی اُمید نہ تھی۔ وقار علی سے روز شام کو ہوٹل میں ملاقات ہوتی تھی۔ وہ بڑا خاموش خاموش سا ہوٹل میں داخل ہوتا۔ اب نہ اس کے ہاتھ میں ٹارچ ہوتی اور نہ رول۔ وہ پینٹ بشرٹ پہنے شریفانہ حلیئے میں ہوٹل آنے لگا تھا۔ پونے سات بجے تک وہ ہوٹل میں بیٹھا ہمارے ساتھ گپیں مارتا رہتا یا خاموشی سے اخبار چاٹتا رہتا اور اگر اُداسی کا دورہ کچھ زیادہ ہوتا تو ہوٹل کی مکھیوں کو شکاری نگاہوں سے گھورے جاتا۔

ایسے ہی ایک دن جب وہ بہت اُداس نظر آ رہا تھا تو میں نے یونہی چھیڑنے کیلئے پوچھا۔

''کیوں وقار صاحب! اب آپ کے بزنس کا کیا حال ہے؟''

''بس یوں سمجھ لو کہ خودکشی کرنے کو جی چاہتا ہے۔'' اس نے مجھے بجھے بجھے سے لہجے میں کہا۔ ''اس کرفیو نے تو اپنا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ نہ کہیں آنے کے نہ جانے کے۔ بس اب تو خواب میں ہی لوگوں کو پکڑتا پھرتا ہوں۔''

''ہاں برسوں پرانی عادت ہے۔ اتنی آسانی سے کیسے چھوٹ جائے گی۔ ویسے گھر تو کاٹنے کو دوڑتا ہو گا۔''

''میں رات کو گھر پر ہوتا ہی نہیں۔''

''اس کرفیو میں کہاں جاتے ہیں آپ؟''

''میری گلی کے ایک مکان میں کچھ طالب علم رہتے ہیں۔ ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔ وہاں رات بھر تاش کی بازی جمتی ہے۔ کچھ طبیعت بہل جاتی ہے۔ یوں تاش کھیلتے کھیلتے اچانک میں کسی

urdunovelist.blogspot.com

باغ کے گوشے میں پہنچ جاتا ہوں۔ لونڈے چیختے ہیں۔ وقار صاحب پتا پھینکو، پتا پھینکو! تب کہیں مجھے ہوش آتا ہے۔"

"لیکن رات کو پولیس گلیوں میں گشت کرتی ہے۔ آپ اپنے گھر کس طرح واپس آتے ہیں؟"

"ہر وقت پولیس گلیوں میں نہیں رہتی۔ وہ لوگ وقفے وقفے سے راؤنڈ مار کر چلے جاتے ہیں پھر پولیس میرا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ میں تو خود دوسروں کو پکڑتا پھرتا ہوں۔ وہ مجھے کیا پکڑے گی!" وقار علی نے جواب دیا۔

پھر کرفیو کی اکیسویں رات کو وہ واقعہ پیش آیا۔ جب وقار علی لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں مشغول تھا تو کسی نے موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس کی بیوی پر ہاتھ صاف کرنا چاہا لیکن اسی وقت وقار علی دیوار پھلانگ کر گھر میں کود پڑا اور اس نے اپنی بیوی اور اس لڑکے کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ دونوں بوس و کنار میں مصروف تھے۔

وقار علی نے بڑے ڈرامائی انداز میں پینٹ کی جیب سے کاپی قلم نکالا اور اس لڑکے کی طرف بڑھاتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔ "لکھو، میں جمال صدیقی ولد فلاں، بیگم وقار علی کے ساتھ بوس و کنار کرتا ہوا پکڑا گیا۔ نیچے اپنے دستخط کرو!"

"لیکن میں تو....." جمال نے کچھ کہنا چاہا۔

"میں تو ویں تو کچھ نہیں۔ جو میں کہتا ہوں کرو ورنہ....." وقار علی نے جملہ ادھورا چھوڑ کر چاقو کھول لیا۔

لڑکے نے کانپتے ہاتھوں سے وہ تحریر لکھ دی۔ تحریر پڑھنے کے بعد وقار علی نے اپنی بیوی سے اس پر دستخط کرنے کو کہا اور یوں فسانہ ختم ہوا۔

اس کے دوسرے دن جب وقار علی ہوٹل آیا تو خاصا ہشاش بشاش تھا۔ چہرے پر سکون کی دھیمی آنچ لئے وہ بہت دیر تک مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا۔ چونکہ اس وقت تک وہ واقعہ میرے علم میں نہیں آیا تھا اس لئے اس کی مسرت میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اسے ٹٹولنے کی بہت کوشش کی مگر اس نے کچھ نہیں بتایا۔ بعد میں مجھے اس واقعے کا علم اسی لڑکے جمال سے ہوا۔ جس کو وقار علی نے اپنی بیوی کے ساتھ بوس و کنار کرتے ہوئے پکڑا تھا۔

جمال ان دنوں ہسٹری میں ایم۔اے کر رہا تھا اور میرے واقف کاروں میں سے تھا۔

واقعہ بیان کرنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔ "یہ واقعہ سننے کے بعد آپ نے میرے بارے میں کیا رائے قائم کی؟"

"یہ ٹھیک ہے کہ آدمی کو دوسرے کی بیوی اچھی لگتی ہے لیکن دوسرے کی بیوی پر اپنا کوئی حق نہیں ہوتا جمال بھائی! ہمیں احترام کرنا چاہئے!" میں نے بہت نرم لفظوں میں اپنا فیصلہ سنایا۔

"لیکن اگر میں یہ کہوں کہ اس معاملے میں، میں بے قصور ہوں تو؟"

"جمال کیا تم بیگم وقار کے ساتھ بوس و کنار کرتے ہوئے نہیں پکڑے گئے؟"

"ہاں ٹھیک ہے، ایسا ہوا لیکن اس کا موقع تو خود وقار علی نے فراہم کیا تھا۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟" میں تقریباً اُچھل پڑا۔

"وہ دو تین روز سے مجھے اپنے گھر سے چائے لانے کے لئے بھیج رہا تھا لیکن اس روز جب میں نے اس کی خواہش کے مطابق چائے لینے کے لئے اس کے گھر کی طرف چلا تو وہ تاش کی بازی چھوڑ کر میرے ساتھ دروازے تک آیا اور میرے کان میں آہستہ سے بولا۔ جمال میں اپنی بیوی کو آزمانا چاہتا ہوں اور جب میں نے اس کے حکم کے مطابق اس کی بیوی پر نظر التفات ڈالی تو وہ کٹی پتنگ کی طرح میری بانہوں میں آ گری۔ اسی وقت وقار علی گھر میں کود پڑا اور اس نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو وہ دیکھنا چاہتا تھا یا ممکن ہے وہ اس منظر کو دیکھنا نہ چاہتا ہو لیکن اسے دیکھنا پڑا۔" جمال نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

جب میں نے یہ عجیب و غریب واقعہ اپنے دوستوں کو سنایا تو کسی کو یقین نہ آیا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شوہر اپنی بیوی کے دامن میں خود آگ لگا دے۔ بہر حال یہ واقعہ پیش آیا اور میرے اندازے کے مطابق اس ڈرامے کی محرک کرفیو کی وہ جلا دراتیں تھیں جن میں ہر آدمی قید ہو کر رہ گیا تھا۔

وقار علی آج بھی علی گڑھ میں موجود ہے اور اس کا "سرمایۂ حیات" بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

□□

urdunovelist.blogspot.com

سات تالے

آخر پکڑی گئی۔

میں نے جب گھر کا دروازہ کھولا تو کمرے میں جلتی ہوئی بتی دیکھ کر میرا شک یقین میں بدل گیا۔ کمرے میں ریحانہ کے علاوہ کوئی اور بھی ہے۔ آخر عورتوں پر کوئی کیسے بھروسا کرے۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ اور سانس روک کر، کواڑ کی جھری میں سے اندر جھانکا۔ جھری سے میری بیوی ریحانہ کی صرف پنڈلیاں نظر آ رہی تھیں۔ پنڈلیاں ننگی تھیں۔ ننگی پنڈلیاں دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ صحن میں پڑا ہوا بھاری ہتھوڑا اُٹھا کر میں نے سوچا اس ہتھوڑے سے آج دونوں کے بھیجے باہر نکال دوں گا۔

اور جوں ہی میں دروازہ کھول کر، بھاری ہتھوڑا تانے کمرے میں داخل ہوا تو میرا ہاتھ بے جان ہو کر نیچے لٹک گیا اور بھاری ہتھوڑا میرے قدموں میں گر پڑا۔ کمرے میں میری بیوی ریحانہ کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

ریحانہ چارپائی پر بے سدھ پڑی تھی۔ اُس کی ٹانگیں شلوار سے بے نیاز تھیں اور اس کی گردن میں کمر بند لپٹا ہوا تھا اور آنکھیں اور زبان باہر اُبل آئی تھیں۔ کمر بند پٹی میں بندھا تھا۔ وہ گلے میں پھندا ڈال کر اس طرح اُلٹی تھی کہ کمر بند کا دباؤ بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ اُس کی روح، اس کا جسم

چھوڑ گئی۔ اُس کی انگلیوں میں تہہ کیا ہوا ایک کاغذ پھنسا ہوا تھا۔ میں نے وہ کاغذ آہستہ سے اُس کی انگلیوں سے کھینچ لیا اور کھول کر دیکھا۔ وہ ریحانہ کی تحریر تھی۔ لکھا تھا۔

"تم نے ہمیشہ مجھ پر شک کیا۔ بغیر کسی وجہ کے مجھے سات تالوں میں بند رکھا۔ کہیں آنے جانے نہ دیا۔ کسی سے ملنے جلنے نہ دیا۔ پڑوس کی عورتوں کی بات تو الگ ہے۔ میں اپنی سگی ماں بہنوں سے بھی صرف تمہاری نگرانی میں مل سکتی تھی۔ شادی کے بعد سے آج تک گھر نہ جا سکی۔ اپنی بہنوں سے ہنس بول نہ سکی۔ مجھے اپنے گھر میں بھی آزادی سے چلنے پھرنے کی اجازت نہ تھی۔ تم گھر میں ہوتے تو میں تمہارے چھوٹے سے کوارٹر کے آنگن میں چل پھر لیتی۔ آنگن کی دیواروں سے اشاروں اشاروں میں باتیں کر لیتی۔ تم جانے لگتے تو مجھے ڈھکیل کر کمرے میں بند کر جاتے۔ پھر یہ کمرہ ہوتا اور میں ہوتی۔ تم پہلے کمرے کے دروازے پر تالا لگاتے پھر گھر کا دروازہ مقفل کر کے اپنی ڈیوٹی پر چلے جاتے اور میرا دل دھواں دھواں ہو جاتا۔ میں روتی نہ سسکتی۔ بس بند دروازے کو تکے جاتی۔ اس طرح پانچ صدیاں میں نے اس قید میں گزاریں۔ تم چاہو تو پانچ سال کہہ لو۔

تمہاری شکی طبیعت نے مجھے قید و بند میں رکھا۔ مجھے بے عزت کیا، طرح طرح سے اذیتیں دیں اور میں صبر کرتی رہی۔ برداشت کرتی رہی۔ یہ سوچ کر شاید ایک دن یہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم میری پاکیزگی کا امتحان لے رہے ہو۔ جب مطمئن ہو جاؤ گے تو خود بخود قفس کا دروازہ کھل جائے گا۔ میں آزادی سے سانس لے سکوں گی۔ سکھ چین کی زندگی گزار سکوں گی۔ اس انتظار میں پورے پانچ سال بیت گئے لیکن تم وہیں کے وہیں رہے۔ پانچ سال کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ خلاف توقع تمہارے پاگل پن میں اضافہ ہوتا گیا اور اب تو تم ڈیوٹی چھوڑ چھوڑ کر مجھے دیکھنے کے لئے آنے لگے ہو کہ کہیں میں (بند کمرے میں) کسی کے ساتھ رنگ رلیاں تو نہیں منا رہی۔

ہائے رے تمہارا پاگل پن۔ ارے بے وقوف انسان کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ عورت کو تالے میں بند کر دیا جائے تو وہ محفوظ رہتی ہے۔ اسے کوئی نہیں چھو سکتا۔ اُسے کوئی نہیں خراب کر سکتا۔ بھلے مانس یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ عورت چاہے تو سات تالوں میں بھی خراب ہو سکتی ہے اور خراب ہو کر بھی پاکیزہ رہ سکتی ہے۔ اتنی کہ اُس کا شوہر اسے مریم ہی سمجھتا رہے۔ اور اگر نہ چاہے تو پھر کوئی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کاش! تم نے اپنی عورت پر بھروسا کرنا سیکھا ہوتا۔ تو آج اس کی نوبت نہ آتی۔

urdunovelist.blogspot.com

میں زندگی بھر پاکیزہ رہتی۔ لیکن تمہاری شکی طبیعت نے مجھے پانچ سال ہی میں داغدار کر دیا۔ مقفل دروازے بھی رکاوٹ نہ بن سکے۔ پگھل کر رہ گئے۔ یہ کیونکر ہوا؟ کیسے ہوا؟ سنو گے یہ تو تمہیں سننا ہی پڑے گا۔

نہیں، نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ ریحانہ کا خط میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میرا جسم کانپ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے ریحانہ کی طرف بڑھا۔ چادر اُٹھا کر اُس کے جسم کو ڈھک دیا اور پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر ریحانہ کے ڈھکے ہوئے جسم کو دیکھنے لگا۔

اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے ریحانہ کے جسم میں حرکت ہونے لگی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے سرخ جوڑا پہن رکھا ہے اور پلنگ کے وسط میں سمٹی سمٹائی بیر بہوٹی بنی بیٹھی ہے۔ میں پٹی پر بیٹھے بیٹھے اس کی طرف جھکا اور جب میں نے آہستہ سے اس کا گھونگھٹ سرکایا تو اس کی شبنمی صورت تکتا ہی رہ گیا۔ وہ میری توقع سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کی من موہنی کامنی سی صورت دیکھ کر مجھے قطعی خوشی نہ ہوئی۔ مجھے لگا جیسے ناگن نے میری پنڈلی میں پھن مار دیا ہو۔ میں نے سوچا ایسی خوبصورت لڑکی مردوں کی میلی نظروں سے کس طرح بچی ہوگی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ اس لڑکی کا دامن بے داغ ہے تو آئندہ اس بات کی کون ضمانت دے گا کہ یہ لڑکی پاکیزہ ہی رہے گی۔ کل ہی تو کوئی کہہ رہا تھا کہ کنواری لڑکی کی ماں باپ اُسی وقت تک حفاظت کرتے ہیں جب تک اُس کی شادی نہ ہو جائے..... شادی کے بعد والدین اپنا پہرا اُٹھا لیتے ہیں اور خود لڑکی بھی شادی کے بعد کھل جاتی ہے۔ بڑی حد تک بے جھجک ہو جاتی ہے۔

میں ریحانہ کے مقابلے میں بدصورت تھا اور یہی بدصورتی مجھے لے ڈوبی۔ میں ہر وقت یہی سوچتا رہتا کہ میں بدصورت ہوں۔ ریحانہ خوبصورت ہے۔ وہ آہستہ آہستہ مجھ میں دلچسپی لینا چھوڑ دے گی اور در پردہ کسی اور سے تعلق قائم کر لے گی۔

کبھی کبھی مجھے اپنے ان خیالات پر بڑا غصہ آتا۔ میں خود کو ایک ہزار گالیاں دیتا۔ اپنے شکی مزاج پر لعنت بھیجتا۔ ریحانہ جیسی لڑکی پر شک کرنا فضول تھا۔ ریحانہ کی پرورش بڑے کٹر مذہبی ماحول میں ہوئی تھی۔ اُس نے آج تک کوئی فلم نہ دیکھی تھی۔ اسکول اور کالج کی آزاد فضا سے بھی ناآشنا تھی کیونکہ میٹرک اس نے پرائیویٹ کیا تھا۔ پھر ریحانہ کا گھرانہ بہت محفوظ تھا۔ اس گھر میں

کسی چچازاد، خالہ زاد یا کسی اور بھائی کا گزر نہ تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اُس نے اپنے والد کے سوا کسی اور مرد کو دیکھا ہی نہ تھا۔ پھر ریحانہ خراب کیسے ہوسکتی ہے۔ مجھے دھوکا کیسے دے سکتی ہے۔

میں اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کرتا اور سوچتا کہ اب آئندہ میں ریحانہ پر شک نہیں کروں گا۔ لیکن یہ خیال اندھیرے میں جگنو ثابت ہوتا۔ کچھ دیر روشنی دکھا کر غائب ہو جاتا اور میں پھر سے اندھیروں میں گھر جاتا۔

ریحانہ کی من موہنی صورت میرے سامنے آتی تو مجھے اپنے سینے پر ریل کا پہیہ چلتا ہوا محسوس ہوتا۔ وہ خوبصورت ہے اور میں بدصورت ہوں۔ وہ کب تک میری رہے گی۔ کیونکر داغدار نہ ہوگی۔

میں نے ریحانہ کو میکے جانے نہ دیا۔ میکے والے لینے آئے بھی تو طرح طرح کے بہانوں سے ٹال دیا۔ آخر میں، میکے میں اُس کی نگرانی کیسے کرتا۔ ریحانہ کا جہاں جی چاہتا جاتی، جس سے چاہے ملتی اور مجھے کچھ پتہ نہ چلتا۔ ریحانہ کی والدہ اور بہنیں کبھی اُس سے ملنے آجاتیں تو میں اُن کے درمیان جم کر بیٹھ جاتا، ریحانہ کو اکیلا نہ چھوڑتا۔ مجھے یہ دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں اُس کی بہنیں میری غیر موجودگی میں ریحانہ کو کچھ سکھا پڑھا نہ جائیں۔ اُسے میرے خلاف نہ کر جائیں۔

شروع شروع میں تو پڑوس کی عورتیں میرے گھر میں آتی رہیں لیکن جب میں نے ان عورتوں میں بلاوجہ کیڑے نکالنے شروع کئے اور سختی سے ریحانہ کو اُن سے ملنے جلنے سے روکا تو پڑوس کی عورتوں نے آنا جانا بند کر دیا۔ بھلا ان عورتوں پر میں کیسے بھروسہ کر لیتا اگر ان کے کہنے سننے پر ریحانہ گھر سے فرار ہو جاتی تو کیا ہوتا۔

میں نے پریس میں اپنے تمام دوستوں سے آہستہ آہستہ تعلقات منقطع کر لئے۔ سب حیرت زدہ تھے لیکن اُن کو گھر سے روکنے کا واحد ذریعہ یہی تھا۔ اگر اتفاق سے کسی دوست کی طبیعت خراب ہو جاتی اور وہ گھر جانے سے پہلے حسب معمول مجھ سے آکر ہاتھ ملاتا اور کہتا۔ ''اچھا یار۔ میں تو چلا۔ سر میں سخت درد ہے۔''

تو مجھے یوں محسوس ہوتا کہ وہ آدمی اپنے گھر جانے کے بجائے، بہانے سے میرے گھر ریحانہ سے ملنے گیا ہے۔ چھٹی ملتے ہی پریس سے دوڑ لگاتا۔ گھر کا تالا کھولتا اور ریحانہ سے سوال کرتا۔

urdunovelist.blogspot.com

''یہاں کون آیا تھا؟''

''بند تالوں میں یہاں کون آسکتا ہے؟'' ریحانہ گردن جھکا کر جواب دیتی۔ پھر میں سوچتا۔ ہاں واقعی بند تالوں میں ریحانہ تک کون پہنچ سکتا ہے اور اپنی حماقت پر مجھے غصہ آنے لگتا۔

پندرہ دن کے بعد میری ڈیوٹی بدل جاتی تھی۔ دن کی ڈیوٹی تو میں جوں توں کر کے گزار لیتا لیکن رات کی ڈیوٹی مجھ پر عذاب بن کر نازل ہوتی۔ بیٹھے بٹھائے مجھے دورہ سا پڑ جاتا۔ میں سوچنے لگتا کہ پتا نہیں میں نے تالے ٹھیک سے لگائے بھی تھے کہ نہیں۔ کہیں کھلے نہ رہ گئے ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی ہزاروں اندیشے میری میز کے گرد کھڑے ہو جاتے اور میں پریس کا کام چھوڑ کر ریحانہ کو جانے کس کس انداز میں دیکھنے لگتا۔ میں منیجر سے ایک گھنٹے کی چھٹی لے کر گھر کی طرف بھاگتا تھا۔ تالے کو جوں کا توں بند پاتا۔ پھر بھی اپنی تسلی کے لئے آہستہ سے انہیں ہلا کر دیکھتا اور خاموشی سے پریس لوٹ جاتا۔ کمرے میں بند ریحانہ کو کچھ بھی پتا نہ چلتا۔

اور پچھلے دنوں سے تو میری عجیب حالت ہوگئی تھی۔ میں ملازمت سے سخت بیزار ہو گیا تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو ملازمت چھوڑ کر بس ریحانہ کے آگے پیچھے پھرتے جاتا۔ اُسے ایک منٹ کیلئے بھی اکیلا نہ چھوڑتا۔ کاش میں نے ایسا ہی کیا ہوتا تو ریحانہ ہرگز خودکشی نہ کر پاتی لیکن ریحانہ نے خودکشی کی۔ وہ آدمی کون تھا۔ یہاں کیسے پہنچا۔ یہ سب کیسے ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ میرا شک اپنی جگہ صحیح تھا۔ خوبصورت عورت کا کیا بھروسا۔ جانے کب دغا دے جائے۔ میں نے زمین سے ریحانہ کا خط پھر اُٹھا لیا۔

''دو دن سے تم نائٹ ڈیوٹی پر جا رہے ہو۔ روز کی طرح شام کو جانے سے پہلے تم نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ تمہارے ہاتھ میں تالا تھا۔ میں خاموشی سے صحن میں پڑے ہوئے پلنگ سے اُٹھی اور سر جھکائے کمرے میں داخل ہوگئی۔ قیدی کے کوٹھری میں داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ چٹخنی لگی۔ تالا کنڈے میں پھنسا، چابی گھومی اور تالے کو زور سے ہلا کر چھوڑ دیا گیا۔ میں حسب معمول دروازے سے پیٹھ لگا کر کھڑی ہوگئی۔ کچھ لمحوں بعد باہر کا دروازہ بند ہوا۔ زور سے چٹخنی بند کی گئی اور پھر تالے کو زور سے ہلا کر چھوڑ دیا گیا اور پھر تم ڈیوٹی پر چلے گئے۔ روز کا عمل ختم ہوا۔

تمہارے جاتے ہی گہرے بادل چھا گئے۔ میرے دل پر، نہیں آسمان پر۔ دل پر تو ہر وقت گھٹا سی چھائی رہتی ہے۔ اُس کا ذکر ہی کیا۔ گہرے دبیز بادلوں نے گرنا شروع کر دیا۔ آسمان بادلوں کی چنگھاڑ اور بجلی کی چکاچوند سے بھر گیا۔ باہر ہوا بہت تیز تھی۔ کمرے کا دروازہ بار بار زور سے بج اُٹھتا اور تنہائی کی تلاش میں کوئی آوارہ ہوا کا جھونکا کواڑ کی جھریوں سے اندر داخل ہوتا تو مجھے دیکھ کر وہیں ٹھٹھک کر رہ جاتا یا اُلٹے قدموں واپس ہو جاتا۔

تھوڑی دیر میں صحن میں چھوٹی چھوٹی کنکریاں گرنے لگیں اور پھر اچانک موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ میں دھڑام سے پلنگ پر گر پڑی اور رو پڑی۔ نہیں، روئی نہیں، میری آنکھوں میں اب آنسو نہیں آتے۔ کبھی آتے تھے تو رو لیتی تھی بلکہ خوب روتی تھی۔ تکیے کے تکیے تر ہو جاتے تھے اور میری آنکھوں کے آبشار بند نہ ہوتے لیکن اب رونا بھی چاہوں تو آنسو نہیں آتے۔ آنکھوں کی جھیلیں خشک ہو چکی ہیں۔ یوں رونا بھی آئے تو کس بات پر سب کچھ تو وہی ہے۔ یکساں!

باہر اندھیرا تھا۔ میرے دل کی گلیاں بھی روشن نہ تھیں۔ کمرے میں بلب جل رہا تھا اور اُس کی روشنی بلیڈ کی دھار بن کر میری آنکھوں کو کاٹ رہی تھی۔

میں نے بتی گل کر دی۔ یہاں سے وہاں تک اندھیرا چھا گیا۔ مجھے کچھ سکون سا ملا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اُٹھوں کپڑے اُتار کر صحن میں جا لیٹوں۔ صحن میں اِدھر سے اُدھر لڑھکتی پھروں۔ کبھی اُٹھوں۔ کبھی گروں۔ کبھی رقص کروں، کبھی دوڑوں۔ بس دیوانی ہو جاؤں۔ بارش ہوتی رہے۔ میرا جسم پگھلتا رہے اور میں تھکی ہاری سی زمین کے سینے سے چمٹی رہوں۔ یہاں تک کہ مجھے نیند آجائے۔

میرا جسم آہستہ آہستہ استری کی طرح گرم ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ عنقریب دکھوں کی بارود میں آگ لگ جائے گی۔ ایک زور کا دھماکا ہوگا اور میرا وجود ریزہ ریزہ ہو کر پلنگ پر بکھر جائے گا۔ میں ڈری ڈری سی اپنے اندر ہونے والے دھماکے کا انتظار کرتی رہی لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

میں بدستور آگ میں جلتی رہی۔ یہ آگ بڑی میٹھی میٹھی سی تھی۔ میں نے ایک زوردار انگڑائی لے کر اپنے جسم میں پیدا ہونے والے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کی لیکن تناؤ بڑھتا ہی گیا۔

میں نے اُٹھ کر بتی جلائی۔ وقت دیکھا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ میں نے کواڑ کی جھری

urdunovelist.blogspot.com

سے صحن میں جھانکا۔ بارش ہلکی ہوگئی تھی۔ صرف بوندا باندی جاری تھی۔ ہوا اب بھی تیز تھی۔ بادلوں کی گرج جوں کی توں تھی۔ کواڑ کی جھری سے آتی ہوئی ٹھنڈی ہوا میری ایک آنکھ اور رخسار کے ایک حصے کو چومتی ہوئی گزر رہی تھی۔

چھ مہینے۔ ہاں چھ مہینے ہی ہوگئے ہوں گے اس بات کو۔ تم نے لاکھ کوشش کی میرے پلنگ تک پہنچنے کی لیکن میں نے سختی سے منع کردیا اور کیوں نہ کرتی۔ تمہارے اور میرے درمیان رشتہ کیا ہے؟ تم مجھے کھانے پہننے کو دیتے ہو۔ اُس کے عوض میں تمہیں پکا کر کھلاتی ہوں۔ تمہارا گھر بار صاف رکھتی ہوں۔ تم جیلر ہو اور میں قیدی۔ پھر تم مجھ سے بیوی کا پیار کیوں مانگتے ہو۔ پہلے جیلر سے شوہر بنو۔ پھر بیوی کا ہاتھ پکڑو۔ اگر وہ پھر بھی انکار کرے تو جو چاہے سزا دو۔ تم حق بجانب ہوگے۔

ٹھنڈی ہوا کے ایک زوردار بوسے نے مجھے چونکا دیا۔ میں کواڑ کی جھری سے ہٹ آئی۔ چھت سے لٹکتے ہوئے بلب کے نیچے کھڑے ہوکر اپنے ہاتھوں سے اُسے چھونے کی کوشش کرنے لگی۔ بلب میرے ہاتھوں کی پہنچ سے دور تھا۔ میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہوکر ہاتھ بلب کی طرف بڑھائے تو جسم میں جوار بھاٹا سا آگیا۔ میرا جسم کمان کی طرح تن گیا اور میں انگڑائی لینے پر مجبور ہوگئی۔

میرے ہاتھ خود بخود شلوار کی طرف بڑھے اور شلوار کولہے سے سرک کر میرے پاؤں میں آگری۔ پھر کُرتے کے بٹن کھلے اور کُرتا میرے ہاتھوں سے گزر کر کپڑے ڈالنے والی ڈوری پر جا گرا اور جھولنے لگا۔ کُرتے کو جھولتے دیکھ کر میرا دل بھی جھولنے کو چاہنے لگا اور میرے ہونٹوں پر ساون کا گیت مچل اُٹھا۔

میں صرف کھال پہنے کھڑی تھی۔ اپنے ننگے جسم سے مجھے حیا آنے لگی۔ میں نے کپڑے تو نہ پہنے۔ البتہ بتی بجھا کر چادر اُوڑھ لی اور اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر دل کی دھڑکن گننے لگی۔

پھر ایک عجیب سی بات ہوئی۔ مجھے لگا کہ جیسے صحن میں کوئی کودا۔ سوچا تم ہوگے۔ تم ہرگز نہیں ہوسکتے۔ ایسی بارش میں ڈیوٹی چھوڑ کر تمہارا آنا ممکن نہیں۔ پھر اگر تم مجھے دیکھنے آئے بھی تو صحن کی دیوار پھلانگنے کی کیا ضرورت تھی۔ چپکے سے تالا کھول کر اندر آسکتے تھے۔

آنے والے کے قدموں کی گھسٹ سنائی دی۔ کوئی کمرے کے دروازے کے پاس رُکا۔ پھر

ایک چھناکا سا ہوا جیسے بہت سی چابیاں گچھے کی قید سے آزاد ہونا چاہتی ہوں۔ تالے میں کئی بار چابی گھمائی گئی۔ پھر کسی چابی سے تالا کھل گیا۔

میں نے سوچا یہ سب میرا تصوّر ہے۔ یہاں بھلا کون آسکتا ہے۔ لیکن جب ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا اور چوکھٹ کے فریم میں مجھے ایک سایہ سا کھڑا دکھائی دیا تو مجھے لگا کہ جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں وہ اٹل حقیقت ہے۔ خواب یا تصوّر نہیں۔

وہ سایہ اب بھی چوکھٹ کے فریم میں کھڑا تھا۔ میں آہستہ سے کھانسی پھر ہمت کرکے بولی۔

"اگر تم چور ہو تو اُلٹے پاؤں واپس چلے جاؤ۔ خدا کی قسم اس گھر میں تمہارے قابل کوئی چیز نہیں۔ اور اگر تم صرف ایک مرد ہو تو بلا خوف اندر آجاؤ۔ تمہارے لئے یہاں بہت کچھ ہے۔"

سایہ چور نہ تھا جو اُلٹے پاؤں واپس ہو جاتا۔ وہ صرف ایک مرد تھا۔ اس لئے تیزی سے میری طرف لپکا۔

urdunovelist.blogspot.com

میں بھی لاوے کی طرح اُبل پڑی۔ پانچ صدیوں سے پکتا ہوا لاوا آخر کب تک اندر دبا رہتا۔ بتی جل اُٹھی۔ چادر دیوار سے ٹکرا کر زمین پر گری اور میں نے اس مرد کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ میں نے چٹاخ چٹاخ اُسے اتنا پیار کیا، اتنا پیار کیا کہ وہ مرد بھونچکا سا میری صورت تکتا رہ گیا۔

تمہیں مجھ سے ہمیشہ شکایت رہی کہ میں پیار کے معاملے میں کبھی پہل کیوں نہیں کرتی۔ تم مجھے برہنہ دیکھنے کے آرزومند رہے لیکن تمہاری آرزو کبھی پوری نہ ہوئی۔ ننگی دیکھنے کی بات تو بہت دور کی ہے۔ میں نے تمہیں بتی جلانے کی بھی اجازت نہ دی۔

اور اُس مرد کے ساتھ میں نے وہ کیا۔ جس کی تمنا لئے تم قبر میں اُتر جاؤ گے۔ ہاں جلو، خوب جلو۔ یہ ساری تفصیل میں اسی لئے بتا رہی ہوں کہ اسے پڑھ کر تم اپنے دل کو تیزاب میں ڈوبا ہوا محسوس کرو۔

ہاں تو میں اُس وقت کی کیفیت بیان کر رہی تھی۔ بس یوں سمجھو کہ میں بند ٹوٹا ہوا دریا تھی۔ وہ تو ایک مرد تھا اگر اُس جیسے کئی مرد بھی ہوتے تو وہ بھی میرے ساتھ بہہ جاتے۔ عورت کے جوش کو تم بھلا کیا جانو۔

اب ایک راز کی بات سن لو۔ اُس مرد کے بارے میں جان لو کہ وہ کون تھا......؟ وہ تمہارا قریبی

عزیز تھا۔ تمہارا بھائی، میرا چھوٹا دیور حسن علی۔ بڑا بھولا مرد ہے۔ کہتا تھا۔

''آؤ بھابھی، تمہیں اس قید سے نکال لے چلوں۔''

میں بھاگنا چاہتی تو حسن علی کے ساتھ بھاگ سکتی تھی لیکن میں اُس کا گھر بگاڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بھی تو بیوی بچوں والا ہے۔

اُس کے جانے کے بعد سب کچھ ویسا ہی ہوگیا۔ میں بے سدھ سی پلنگ پر گر پڑی اور رو پڑی۔ ہاں واقعی رو پڑی اور اتنا روئی کہ میری آنکھیں سوج گئیں، سر درد سے پھٹنے لگا۔

جو کچھ ہوا وہ اچھا نہ ہوا۔ یہ سب کچھ میں نے انتقاماً کیا۔ انتقام کی آگ سرد پڑتے ہی میں گناہ کی آگ میں جلنے لگی۔ میرے گرد گناہ کے شعلے لپٹے ہوئے تھے اور میرے چہرے پر سیاہ نقاب پڑی تھی۔ رہ رہ کر دل میں وسوسے سے اُٹھ رہے تھے۔ ہائے یہ میں نے کیا کیا۔ اب مالک حقیقی کے پاس کیا منہ لے کر جاؤں گی۔

خوفِ الٰہی سے میں لرز لرز اُٹھی۔ گھبراہٹ میں اُٹھ کر کھڑی ہوگئی، دماغ چکرانے لگا۔ کمرے کی دیواریں گھومتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں فوراً پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ورنہ زمین پر گر جاتی۔

جب ذرا طبیعت سنبھلی تو میں نے شلوار سے کمر بند نکال لیا۔ کمر بند کو دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر دیکھا۔ اُسے بہت مضبوط پایا۔ اور جب تم کمرے کا دروازہ کھولو گے تو مجھے ہر قید سے آزاد پاؤ گے۔ تمہارے ظلم تو میں نے سہہ لئے لیکن اب اپنا سیاہ چہرہ آئینے میں دیکھنے کی ہمت نہیں، اس لئے مر رہی ہوں۔

☆.....☆.....☆

حسن علی..... تیری یہ جرأت، میں نے اسی دن کے لئے تجھے پال پوس کر جوان کیا تھا تو اپنے بڑے بھائی اپنے باپ کی عزت پر ہاتھ ڈالنے سے بھی نہ چوکا۔ میں آج تیرا خون پی جاؤں گا۔ میں غصے میں، تھر تھر کانپ رہا تھا اور تیزابی آگ میرے جسم کو پگھلائے دے رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

جب میں نے حسن علی کا دروازہ کھٹکھٹایا اس وقت مسجدوں سے اذان کی آوازیں آرہی تھیں اور میں بغل میں چھری دبائے حسن علی کا منتظر تھا لیکن دروازہ حسن علی کی بیوی نے کھولا۔ وہ مجھے دیکھ کر

فوراً پیچھے ہٹ گئی۔

''حسن علی کہاں ہے؟'' میں نے نرمی سے پوچھا۔

''وہ تو کمپنی کے کام سے کراچی گئے ہوئے ہیں۔ آج پندرہ دن ہوگئے، انہیں گئے ہوئے۔ کل خط آیا تھا۔ لکھا ہے کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے مزید ایک ماہ کراچی میں ٹھہریں گے۔ آپ دروازے میں کیوں کھڑے رہ گئے۔ اندر آجایئے بھائی جان۔'' حسن علی کی بیوی گھونگھٹ کی اوٹ سے بولی۔

حسن علی کو گئے ہوئے پندرہ دن ہوگئے۔ اوہ۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں حسن علی کی بیوی سے صرف اتنا کہہ سکا۔

''رشیدہ..... ریحانہ نے خودکشی کرلی۔ وہ وفا کی آگ میں جل مری۔ اب میں کیسے زندہ رہوں۔''

□□

urdunovelist.blogspot.com

سیاست

مسرت احمد جب قتل کے الزام میں گرفتار ہوئیں تو پورے بھارت میں ایک زلزلہ سا آ گیا۔ اخباروں نے شہ سرخیاں جمائیں۔ ریڈیو نے خصوصی بلیٹن نشر کئے۔ دوردرشن نے اپنی خبروں میں، اس قیامت خیز خبر پر خصوصی رپورٹ ٹیلی کاسٹ کی۔

ہر طرف ایک شور تھا۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ جنتا پارٹی کی لیڈر، جنتا کی ہمدرد کسی کو قتل بھی کر سکتی ہے۔ غریبوں کو حق دلانے والی، کسی غریب کی زندگی بھی چھین سکتی ہے۔ غریبوں کی محافظ، کسی غریب کو کچل بھی سکتی ہے۔ مگر ایسا نہ تھا۔ ایسا ہو گیا تھا۔

اس خبر نے جہاں کروڑوں دلوں کو سوگوار کیا تھا، وہاں کچھ چہرے ایسے بھی تھے جن پر مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس واردات نے حالات کو یکلخت بدل دیا تھا۔ انتخابات کا پانسا پلٹ گیا تھا۔

جس کو جیتنا تھا وہ ہار گئی تھی اور جس کو ہارنا تھا، وہ جیت گیا تھا۔

مسرت احمد ایک بڑے جلسہ عام سے خطاب کرنے جا رہی تھیں۔ انتخابات کی مہم بڑے زور و شور سے جاری تھی۔ یہ جلسہ اس انتخابی مہم کا آخری جلسہ تھا کیونکہ اس کے بعد پروپیگنڈے کا وقت ختم ہو جانا تھا۔ اس جلسے کا لوگ بڑی شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ یہ جلسہ بہت اہم تھا۔ یہ جلسہ مدمقابل کے لئے تابوت میں آخری کیل بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

ابھی دو تین دن پہلے کی بات تھی۔ انتخابی مہم اپنے عروج پر تھی۔ مسرت احمد کے جلسے بڑی کامیابی سے منعقد ہو رہے تھے۔ ان کے جلسوں میں اتارش ہوتا۔ اتنے لوگ ہوتے کہ تل دھرنے کی جگہ بھی باقی نہ رہ جاتی جبکہ مدمقابل کے جلسوں میں عوام کو ٹرکوں پر لاد کر لایا جاتا، انہیں ہر جلسہ اٹینڈ کرنے اور ہر نعرے کی اُجرت دی جاتی، پھر بھی جلسہ گاہ نہ بھرتی۔

مدمقابل کے لئے مسرت احمد کو ہرانا اور اس الیکشن کو جیتنا زندگی اور موت کی طرح اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ یہ انتخاب اس کی اَنا کا مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے آبائی گھر پر اُسے کوئی شکست دے جائے۔

الٰہ آباد، مدمقابل کا آبائی شہر تھا۔ یہاں سے اُس کے باپ دادا نے سیاست لڑی اور ہمیشہ کامیاب رہے تھے۔ ماں کے قتل کے بعد حکومت اب اُس کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ یہ خاندان جیسے بھارت کی تقدیر بن گیا تھا۔ ورثے میں حکومت ملتی چلی آئی تھی۔

اب اُسی حکومت کو ایک عورت نے چیلنج کر دیا تھا۔ مسرت احمد نے کہا تھا۔ ''راکیش صاحب مجھ سے مقابلہ کر کے دیکھ لیں، اگر وہ چاہیں تو میں ان کے آبائی شہر سے بھی الیکشن لڑنے کو تیار ہوں۔''

یہ چیلنج راکیش صاحب کے لئے چھچھوندر بن گیا تھا، نہ اگلتے بنتی تھی نہ نگلتے لیکن صورتحال کچھ ایسی بن گئی تھی کہ کوئی نہ کوئی فیصلہ ضرور کرنا تھا۔ بغیر فیصلے کے آگے نہیں بڑھا جا سکتا تھا۔ اس مسئلے کو ہنس کر نہیں ٹالا جا سکتا تھا۔ یہ نہ صرف ان کی اَنا کا مسئلہ تھا، بلکہ پارٹی کی آزمائش کا مسئلہ بھی تھا۔

مسرت احمد کی اُبھرتی ہوئی قیادت دیکھ کر راکیش صاحب نے انہیں پارٹی کے ٹکٹ کی پیشکش کی تھی تو انہوں نے جواب دیا تھا۔ ''میرے باپ کو آپ کی پارٹی نے کیا دے دیا؟ جواب آپ مجھے دے دیں گے۔''

پیشکش لانے والے نے مؤدبانہ جواب دیا۔ جو راکیش صاحب کا دستِ راست اور پارٹی کا صدر تھا۔ ''آپ کے والدِ محترم وقار احمد کو اُتر پردیش کا وزیرِ اعلیٰ بنایا تھا۔''

یہ بات سن کر مسرت احمد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ انہیں یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اس وقت کی حکومت نے ان کے باپ کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ لیکن یہ وقت غصہ دکھانے کا نہ تھا۔ سیاست میں کبھی غصہ نہیں دکھایا جاتا۔ ہر چیز کو ٹھنڈا کر کے کھانے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ مسرت احمد کو بھی

urdunovelist.blogspot.com

ان کے والد نے یہ سبق پڑھا رکھا تھا لیکن جب بات ان کے والد کی آجاتی تو ان کا چہرہ ایک دم سرخ ہو جاتا۔ انہیں اپنے والد سے شدید لگاؤ تھا۔

اب بھی جب پارٹی کے صدر نے حکومتِ وقت کی عنایت کا ذکر کیا تو ان کے جسم میں جیسے پٹاخے سے چھوٹے تھے لیکن انہوں نے فوراً ہی خود پر قابو پایا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کتنے دن کے لئے؟''

''لیکن اس میں حکومت کا تو کوئی قصور نہ تھا۔ ان کی عمر نے ہی وفا نہ کی۔'' پارٹی کے صدر نے دلیل دی، لیکن یہ دلیل دے کر وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈال سکا۔ آنکھوں کے ساتھ ہی اُس کی گردن بھی جھک گئی۔

یہ جھکی ہوئی آنکھیں، یہ جھکی ہوئی گردن، اَن کہی کہانیاں سنا رہی تھی۔

''شریمان جی۔'' مسرت احمد نے قصداً اس کا نام لینے سے پرہیز کیا۔ ''یہ تو بتائیں کہ ان کی عمر نے کیوں وفا نہ کی؟''

''یہ تو پرماتما ہی بتا سکتا ہے؟'' پارٹی کے صدر نے بڑے شاطرانہ انداز میں اوپر اُنگلی اُٹھائی۔

''پرماتما کو کیوں درمیان میں لاتے ہو، خواہ مخواہ، یہ بات تو بھارت کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ وقار احمد کو کس نے مارا۔''

''میں راکیش صاحب کو کیا جواب دوں؟'' پارٹی کا صدر فوراً اصل موضوع پر آ گیا کیونکہ مسرت احمد نے جو موضوع چھیڑ دیا تھا اس کا جواب کم از کم اس کے پاس نہ تھا۔

''راکیش صاحب سے کہئے گا، مسرت کسی قیمت پر ان کی پارٹی میں شمولیت کے لئے تیار نہیں، وہ ابھی کچھ دن اور جینا چاہتی ہے، جنتا کی سیوا کرنا چاہتی ہے۔''

''دیوی جی! ایک بار اور غور فرمالیں۔ یہ بہت سخت جواب ہے۔'' پارٹی کے صدر نے ایک طرح سے اُسے تنبیہہ کی۔

''میں بہت سوچ سمجھ کر جواب دینے کی عادی ہوں اور یہ جواب بھی میں نے بہت سوچ سمجھ کر دیا ہے۔'' مسرت احمد نے بڑے عزم سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' پارٹی کے صدر نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔ ''مجھے اب اجازت دیجئے، میں

چلتا ہوں۔''

پارٹی کے صدر کے جانے کے بعد انہوں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ زور سے بند کیا اور دھیرے دھیرے اپنے والد وقار احمد کی تصویر کی طرف بڑھیں۔ لائف سائز کی اس تصویر میں وہ شیروانی اور علی گڑھ کٹ پاجامہ پہنے بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہے تھے۔ ان کی خوبصورت آنکھوں میں کوئی سحر تھا۔ ایسا سحر کہ آدمی دیکھتا تو دیکھتا رہ جاتا۔

مسرت احمد اس تصویر کے بہت قریب آ گئیں اور اپنے پاپا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''میں نے ٹھیک کیا نا پاپا؟''

انہیں لگا کہ جیسے ان کی تائید میں وقار احمد کی آنکھیں مسکرائی ہیں۔

لیکن جب پارٹی کے صدر نے وزیراعظم راکیش کو مسرت احمد کا جواب سنایا تو ان کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ''بے وقوف عورت۔''

اور جب مسرت احمد نے اپنی پارٹی کے صدر رامارا ؤ کو اپنا جواب بتایا تو اس نے ان کے سر پر خوشی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''بے مثال عورت۔''

مسرت احمد ایک عورت تھیں، اس سے کسی کو انکار نہ تھا، وہ بے وقوف عورت تھیں، یہ غلط تھا۔ وہ بے مثال عورت تھیں، یہ صحیح تھا۔

ان کے والد وقار احمد خود ایک بے مثال آدمی تھے۔ وہ سیلف میڈ آدمی تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں اپنی زندگی بنائی، اپنی تقدیر جگائی تھی۔

وہ غریب والدین کی اولاد تھے لیکن انہوں نے غربت کو کبھی اپنی زندگی کا مسئلہ نہ بنایا۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ اخبار بیچتے رہے۔ اخبار فروخت کرتے کرتے انہوں نے گریجویشن کر لیا۔ اور گریجویشن کر کے بھی انہوں نے اخبار سے ناتا نہ توڑا۔ انہوں نے اخبار چھاپنے کی داغ بیل ڈالی۔ روزنامہ ''پرکاش'' جب لکھنؤ کی سرزمین سے پھیلنا شروع ہوا تو اس نے بہت جلد پورے صوبے میں اپنی جگہ بنالی۔ یہ ایک ہندی کا روزنامہ تھا جسے ایک مسلمان نے نکالا تھا۔ اس وقت کی وزیراعظم نے اس اخبار کا فوری طور پر نوٹس لیا۔ وقار احمد بہت تیزی سے حکومت کی نظروں میں معتبر ہوتے گئے۔ وزیراعظم نے ان سے تعلقات بڑھائے۔ پھر وہ انہیں سیاست میں لے گئیں۔

urdunovelist.blogspot.com

وقار احمد کا ''پرکاش'' ایک طرح سے حکومت کا اخبار بن گیا۔ اخبار سے وقار احمد نے خاصی شہرت کما لی تھی۔ وہ سیاست میں آئے۔ یہی کمائی ہوئی شہرت ان کے کام آئی۔ پارٹی کے ٹکٹ پر وہ صوبائی اسمبلی کے ممبر بنے اور پھر وزیر اعظم کی عنایتوں سے اُتر پردیش کے وزیر اعلیٰ بنے۔ جب وقار احمد وزیر اعلیٰ بنے تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ مکمل طور پر وزیر اعظم کے پابند ہیں۔ وہ کوئی بڑا قدم وزیر اعظم کی مرضی کے بغیر نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ وقار احمد نے زندگی کو ہمیشہ اپنی ٹھوکروں میں رکھا۔ اس سے کھلونے کی طرح کھیلا تھا، لیکن اب وہ اتنے بااختیار ہو کر بھی اتنے پابند ہو گئے تھے کہ ان کا دم گھٹنے لگا تھا۔ پھر ان کا اخبار ''پرکاش'' جس نے ہمیشہ سچ کا اُجالا پھیلایا تھا، ایک طرح سے حکومت کا پروپیگنڈا آرگن بن کر رہ گیا تھا۔

تب کئی باتوں پر ان کی وزیر اعظم سے جھڑپ ہوئی، وزیر اعظم جو بظاہر ایک جمہوریت پسند ملک کی سربراہ تھیں لیکن اندر سے انتہائی ڈکٹیٹرانہ ذہنیت رکھتی تھیں، وہ ان اختلافات کو برداشت نہ کر سکیں۔ وہ کہتی تھیں کہ وقار احمد، دیکھتے جاؤ، میں تمہیں ایک دن بھارت کا صدر بنا دوں گی، لیکن وقار احمد کو ایسا ''شوپیس'' صدر بننا منظور نہ تھا۔ انہوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ وزیر اعظم ایک مسلمان کو آگے بڑھا کر محض اپنی جمہوریت پسندی کا ڈھونگ رچانا چاہتی ہیں۔ وقار احمد اندر سے بہت مضبوط آدمی تھے۔ انہوں نے وزیر اعظم کا شوپیس بننا منظور نہ کیا۔

جواب میں انقلاب آیا۔ پہلے ان کی کرسی چھنی۔ کرسی چھننے پر جب انہوں نے اپنے اخبار میں شور مچایا تو اخبار بند کرنا ذرا مشکل کام تھا اس لئے اسے تو بند نہ کیا مگر اُس اخبار کو کنگال کرنے کے حربے آزمائے گئے لیکن وقار احمد جب ہر حربہ جھیل گئے تو پھر ایک آخری حربہ آزمایا گیا۔

ایک دن ایک بڑے جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے ان پر گولی چلوائی گئی، پھر گولی چلانے والے کو بھی اسی وقت ختم کر دیا گیا۔ اس طرح وقار احمد کے ساتھ ہی قاتل بھی مقتول ہوا اور کوئی کبھی یہ بات نہ جان سکا کہ وقار احمد کو مقتول بنانے والے ہاتھ کس کے تھے؟

مسرت احمد، وقار احمد کی اکلوتی اولاد تھیں۔ ان کے قتل کے بعد اپوزیشن کے لیڈروں نے انہیں وزیر اعظم اور پاپا کے درمیان جھگڑوں کی ان کہی، کہانیاں سنائیں۔ وہ ان کہانیوں کو بڑی حیرت سے سنتی رہیں پھر انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے والد کے مشن کو پورا کریں گی۔

روزنامہ ''پرکاش'' نکل رہا تھا لیکن وقار احمد کے انتقال کے بعد جیسے اس میں سے روح نکل گئی تھی۔ وہ سسک رہا تھا۔ انہوں نے روزنامہ ''پرکاش'' کو زندہ کیا۔ پھر یہ اخبار حکومت کے خلاف زہر اُگلنے لگا۔ یہ زہر کیونکہ حقیقت پر مبنی تھا، اس لئے اس اخبار نے بہت جلد اپنی پوزیشن مستحکم کر لی۔

اس سے پہلے کہ وزیر اعظم، وقار احمد کی بیٹی مسرت احمد کے اس اخبار کو ''فکس اپ'' کرتیں، اوپر سے خود ان کے فکس اپ ہونے کے آرڈر آ گئے۔ وہ پرلوک سدھاریں اور حکومت کی باگ ڈور ورثے میں راکیش صاحب کے ہاتھ آ گئی۔

راکیش کے وزیر اعظم بنتے ہی مسرت احمد نے سیاست کے میدان میں کودنے کا ارادہ باندھا۔ وہ ایک مضبوط اور اچھی شہرت کی مالک تھیں۔ کوئی بھی پارٹی انہیں انتخابات لڑنے کے لئے ٹکٹ دے سکتی تھی لیکن ان کا اپنا رجحان جنتا پارٹی کی طرف تھا۔ یہ پارٹی راماراؤ کی تھی۔ راماراؤ وقار احمد کے دوست تھے، ان کی زندگی میں وہ گھر آتے رہے تھے۔ مسرت احمد کی اکثر ان سے ملاقات ہوتی۔ وہ ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب مسرت احمد نے سیاست میں آنے کے بارے میں سوچا تو آنکھیں بند کر کے جنتا پارٹی جوائن کر لی۔

اب مسرت احمد کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا بن گئی تھیں۔ راکیش صاحب بھی اپنی ماں کے بیٹے تھے۔ کھانے کے دانت اور دکھانے کے دانت اور۔ اوپر سے جمہوریت کا غازہ اندر سے آمرانہ لوشن کی فاؤنڈیشن۔ انہوں نے پہلے محبت کی مار ماری۔ پارٹی کے صدر کو ان کی خدمت میں بھیجا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ جو پارٹی بھلا ان کے والد کو کھا گئی، وہ اس پارٹی میں کس طرح شمولیت اختیار کر لیتیں۔ ان کے اس انکار نے راج بھون کے در و دیوار کو ہلا دیا۔

پھر مسرت احمد نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے اخبار میں اس سنہری پیشکش کی خبر چھاپی اور اس کے بعد حکومت کے خلاف ان کا پروپیگنڈا تیز تر ہو گیا۔ وہ وقار احمد کی بیٹی تھیں جو بنیادی طور پر صحافی تھے۔ صحافی جن کی زندگی تجسس اور کھوج میں گزرتی ہے، اسی تجسس کے جذبے نے انہیں حکومت کی کمزوریوں تک پہنچا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مسرت احمد اور راکیش صاحب میں براہِ راست ٹھن گئی۔

urdunovelist.blogspot.com

انتخابات آئے تو مسرت احمد نے راکیش صاحب کو چیلنج کر دیا کہ وزیر اعظم جس علاقے سے چاہیں ان سے الیکشن لڑ کر دیکھ لیں۔ وہ ان کے آبائی شہر الٰہ آباد سے بھی مقابلہ کرنے کیلئے تیار تھیں۔ یہ چیلنج تیر کی طرح ان کے دل پر لگا۔ پارٹی اور اپنے وقار کی خاطر اس چیلنج کو قبول کرنا ضروری تھا۔ لہٰذا راکیش صاحب نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔

انتخابی مہم زوروں پر تھی۔ مسرت احمد بھی ہر جلسے میں حکومت کا کوئی نہ کوئی کچا چٹھا کھولتی تھیں اور آخری جلسے کے لئے انہوں نے بہت کچھ بچا کر رکھا ہوا تھا۔ راکیش صاحب سے متعلق ان کے پاس کچھ ایسا مواد تھا جو ان کی شخصیت کو تباہ کر سکتا تھا۔

ابھی دو تین دن پہلے کی بات تھی۔ مسرت احمد کے گھر حکومت کا ایک اعلیٰ افسر آیا تھا۔ اس اعلیٰ افسر کو دیکھ کر مسرت احمد مسکرائی تھیں۔

''آپ آئے ہیں تو ضرور کوئی خطرناک پیغام لائے ہیں؟''

''نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں، میں تو صرف ایک کپ چائے پینے حاضر ہوا ہوں۔'' اس اعلیٰ افسر نے فوراً پینترا بدلا۔

''ارے صاحب، آپ چائے کی بات کرتے ہیں لیکن ہم آپ کو کھانا کھلا کر بھیجیں گے۔'' مسرت احمد نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''کہئے آپ کی انتخابی مہم کیسی چل رہی ہے؟'' اعلیٰ افسر نے موضوع بدلا۔

''اللہ کا شکر ہے، بہت اچھی ہے۔ کیا آپ کو کچھ اندازہ نہیں۔'' مسرت احمد نے پلٹ کر پوچھا۔

''ہم فائلوں میں گھرے رہنے والے لوگ ہیں۔ ہمیں کیا معلوم۔'' معصومیت دکھائی گئی۔

''اچھا۔'' مسرت احمد نے بڑے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''راکیش صاحب کو کچھ پتا ہوگا۔''

''مادام! کیا درمیان کی کوئی راہ نہیں نکل سکتی۔'' براہِ راست بات شروع ہوگئی۔

''جناب، میں سمجھی نہیں، آپ کس راہ کی بات کر رہے ہیں۔'' وہ انجان بن گئیں۔

''یہی۔'' اتنا کہہ کر وہ اعلیٰ افسر خاموش ہوگیا۔ اس کی نظریں وقار احمد کی لائف سائز تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے اچانک اس تصویر سے نظریں ہٹائیں۔ ''یہ سیاست کی راہ کس قدر پُرخطر ہے۔''

''آپ مجھے ڈرانے آئے ہیں۔'' مسرت احمد نے انہیں ترچھی نظروں سے دیکھا۔

''نہیں، میں ڈرانے نہیں آیا۔ بس آپ کے پاپا کی تصویر دیکھ کر اچانک ایک خیال ذہن میں آیا تھا جس کا میں نے اظہار کر دیا۔'' اعلیٰ افسر، اعلیٰ افسر تھا۔ لہٰذا اس نے اعلیٰ بات کی۔

''اچھا۔'' مسرت احمد نے اسے دیکھا۔ ''کیا پئیں گے، چائے یا کافی۔''

''کافی مل جائے تو بہت اچھا ہے، سردی بھی اچھی خاصی ہے۔'' وہ بولا۔

''جی بہتر۔'' مسرت احمد اپنی ملازمہ کو کافی بنانے کا کہنے اندر گئیں۔ جب وہ واپس آئیں تو اعلیٰ افسر، وقار احمد کی تصویر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

''مادام، میں آپ سے ایک ذاتی نوعیت کا سوال پوچھ سکتا ہوں؟''

''میں جانتی ہوں، آپ کیا پوچھیں گے؟''

''کیا پوچھوں گا بھلا؟'' اعلیٰ افسر نے سوال کیا۔

''یہی کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی اب تک؟'' انہوں نے جواب دیا۔

''میرا مخلصانہ مشورہ آپ کو یہی ہے کہ آپ شادی کر لیں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کہاں سیاست کے پُرخطر راستوں پر چل پڑی ہیں، شادی کر لیں، اپنا اخبار سنبھالیں۔ حکومت آپ کے اخبار کو مزید ترقی دینے کی کوشش کرے گی۔ آپ کا اخبار حکومت کا مخالف ہی سہی۔''

''آپ میرا کوئی رشتہ لائے ہیں؟'' مسرت احمد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''رہی بات ترقی کی تو مجھے اپنے اخبار کی ترقی کے لئے حکومت کی کسی امداد کی ضرورت نہیں۔''

''میرا مطلب یہ تھا کہ.....''

''میں آپ کا سارا مطلب سمجھ گئی ہوں، اب آپ کافی پئیں؟'' انہوں نے ملازمہ سے ٹرے لے کر میز پر رکھی اور خاموشی سے کافی بنانے لگیں۔

''دیکھئے مادام، میں یہاں اس لئے آیا تھا۔'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''ہاں، کس لئے آئے تھے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''مادام! بات یہ ہے کہ صاف ستھری سیاست اچھی ہوتی ہے، آپ نے جلسوں میں انکشافات کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ پھر آخری جلسے میں آپ کسی بڑے انکشاف کی عوام کو نوید دے رہی

urdunovelist.blogspot.com

ہیں۔اس قسم کے انکشافات سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔"

"نقصان پہنچے گا؟" سوال کیا گیا۔

"ہاں، ہوسکتا ہے۔" جواب ملا۔

"پھر آپ راکیش صاحب سے کہئے کہ وہ جو نقصان مجھے پہنچانا چاہتے ہیں، ضرور پہنچائیں۔"

"اچھا ہوتا کہ کوئی درمیان کی راہ نکل آتی۔"

"اب درمیان کی کوئی راہ باقی نہیں رہی۔ اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اور وہ ہے سچائی کا۔ میں جو کچھ اپنے جلسوں میں کہہ رہی ہوں اور اخبار میں چھاپ رہی ہوں، وہ سب سچ ہے اور سچ کہنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ آپ، نہ راکیش صاحب، کوئی بھی نہیں۔"

کہنے کو تو وہ کہہ گئیں کیونکہ وہ سچائی پر تھیں لیکن اس دنیا میں روکنے والا ہاتھ بڑا مضبوط ہوتا ہے۔ ایسا ہاتھ دکھائی بھی نہیں دیتا اور کام بھی اپنا کر جاتا ہے۔

یہی ہوا، وہ اپنے آخری جلسے سے خطاب نہیں کر سکیں۔ ان کے دل کی بات دل میں رہ گئی۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتی تھیں، اگر وہ عوام کے سامنے پہنچ جاتا تو الیکشن کا نقشہ بدل جاتا۔ وہ اس جزیرے کی کہانی سنانا چاہتی تھیں جہاں راکیش صاحب بس آرام کرنے کی غرض سے گئے تھے۔ وہاں کیا ہوا تھا، اس کی پل پل کی رپورٹ اور تصاویر ان کے پاس موجود تھیں۔

راکیش صاحب کو بھی یہ بات کسی طرح معلوم ہوگئی تھی کہ آخری جلسے میں کیا انکشاف ہونے والا ہے، لہٰذا انہوں نے آخری جلسے کی نوبت ہی نہ آنے دی۔

مسرت احمد بڑے عزم سے آخری جلسے سے خطاب کرنے کیلئے اپنے گھر سے نکلی تھیں۔ گاڑی وہ خود چلا رہی تھیں۔ دسمبر کی سرد شام تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ دُھند اتنی تھی کہ رات کا سا سماں محسوس ہو رہا تھا۔ مسرت احمد اپنی پارٹی کے آدمیوں سے جو اُن کی گاڑی میں موجود تھے، آج کے جلسے کے نتائج پر بات کر رہی تھیں۔ گاڑی میں ایک جوش کی سی فضا تھی۔ ہر شخص پُر جوش انداز میں بول رہا تھا۔

تب ہی مسرت احمد نے بڑے زور سے بریک لگائے لیکن گاڑی رکتے رکتے اس کے اوپر سے گزر گئی۔ وہ جو بھی تھا اچانک ان کی گاڑی کے سامنے آیا تھا اور ہلاک ہوگیا تھا۔

ابھی مسرت احمد کے ہوش و حواس بھی درست نہ ہوئے تھے کہ ایک پولیس کی جیپ موقع واردات پر وارد ہوگئی۔ کچھ ہی دیر میں فوٹو گرافر حضرات بھی آ گئے۔ مسرت احمد کی کھٹا کھٹ تصاویر اُترنے لگیں۔ اسی وقت انہیں قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

جس جلسے سے مسرت احمد نے خطاب کرنا تھا، اس جلسے سے راکیش صاحب نے خطاب کیا تھا، عوام مسرت احمد کے بجائے انہیں اسٹیج پر دیکھ کر حیران رہ گئے۔

انہوں نے بڑے دُکھ بھرے لہجے میں خطاب کیا، انہوں نے کہا۔ "عوام کی ہمدرد نے ایک غریب آدمی کو بے دردی سے کچل دیا ہے جو عورت اپنی گاڑی ٹھیک سے نہ چلا پاتی ہو، وہ عوام کی گاڑی کس طرح چلائے گی۔"

مسرت احمد گرفتار ہو کر حوالات میں پہنچیں۔ ان کے ساتھ ہی دوسرے دن کا اخبار بھی مارکیٹ میں نہ آسکا۔ انہوں نے سوچا کہ جو بات وہ جلسے میں نہیں کہہ سکی ہیں، وہ اپنے اخبار کے ذریعے عوام میں لے آئیں گی لیکن یہ حسرت بھی دل ہی دل میں رہی۔ اخبار کے دفتر میں اچانک آگ بھڑک اُٹھی۔ دفتر کے ساتھ اخبار کا پریس بھی جل کر خاکستر ہوگیا۔

اس حادثے نے حالات کو یکلخت بدل دیا جس کو جیتنا تھا، وہ..... ہار گئی اور جس کو ہارنا تھا، وہ جیت گیا۔

مسرت احمد کو حوالات سے جیل منتقل کر دیا گیا۔ کیس اتنا مضبوط بنایا گیا کہ ضمانت کے راستے بھی بند کر دیئے گئے۔ مسرت احمد کا وکیل جب جیل میں ان سے ملا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ آپ کا کچھ نہ بگڑے گا۔ پہلی پیشی میں ہی آپ باعزت بَری ہو جائیں گی۔ آپ باہر جا کر انتخابات میں جو دھاندلی ہوئی ہے، اس کے خلاف پٹیشن بھی دائر کر سکیں گی۔ میں نے تمام تیاری مکمل کر لی ہے۔"

مسرت احمد نے اپنے وکیل کو خوش ہو کر دیکھا۔ "مجھے آپ کی ذہانت پر کوئی شبہ نہیں۔"

وکیل کی ذہانت پر واقعی کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے پہلی پیشی میں ہی یہ بات ثابت کر دی کہ یہ قتل کسی لاپروائی یا غفلت کا نتیجہ نہیں، بلکہ سازش کا نتیجہ ہے اور اس کے ثبوت میں اس نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ عدالت کے سامنے رکھی۔

urdunovelist.blogspot.com

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اس شخص کی موت حادثے سے چار گھنٹے قبل ہوئی تھی۔ جب وہ شخص مسرت احمد کی گاڑی کے نیچے آیا تو زندہ نہ تھا، مردہ تھا اور وہ خود گاڑی کے نیچے نہیں آیا تھا، بلکہ اسے گاڑی کے سامنے اچانک پھینکا گیا تھا۔

مسرت احمد کو باعزت بری کر دیا گیا۔ اس کیس کے حوالے سے مسرت احمد نے اعلیٰ عدالت میں الیکشن دوبارہ کرائے جانے کی اپیل کی کیونکہ اس الیکشن میں نہ صرف سازش کے ذریعے مسرت احمد کو پھنسایا گیا تھا بلکہ دھاندلی بھی ہوئی تھی۔

اعلیٰ عدالت نے اس انتخاب کو کالعدم قرار دے دیا۔ یہ ایک تاریخی فیصلہ تھا جو حکومتِ وقت کے خلاف دیا گیا تھا، ایسے فیصلے ہمیشہ تاریک راتوں میں دیے کی طرح جھلملاتے ہیں۔

مگر مسرت احمد جو عوام کے دلوں کا اُجالا تھیں، دوسرا الیکشن نہ لڑ سکیں۔ ان کی زندگی کا دیا بجھ گیا۔ بس اچانک ہی ایسا ہوا۔

عدالت نے جس شخص کی حادثاتی موت کو قتل تسلیم نہیں کیا تھا اور مسرت احمد کو باعزت بری کر دیا تھا۔ اس کے لالچی اور آوارہ بیٹے نے اپنے باپ کے اصل قاتلوں سے اپنی یتیمی کے دام کھرے کر لئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ بھاری معاوضے اور قتل کے الزام سے بچانے کے وعدے پر اس نے مسرت احمد کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے راکیش کے راستے سے بھی ہٹا دیا۔

اسی طرح اقتدار کے نشے میں چُور راکیش جس عورت کو قاتل بنا کر پھنسانے میں ناکام رہا تھا، اسے آسانی سے مقتول بنا دیا گیا تھا کہ یہی سیاست میں کامیابی کا راز ہے اور اسی کا نام سیاست ہے۔

□□

کہانیوں کا شہر

میں نہ جانے کیوں اس شہر میں آ گیا ہوں۔

بمبئی!

جو ایک بہت بڑا شوکیس ہے۔ یہاں کی ہر چیز میں دکھاوا ہے۔ ہر شے میں نمائش ہے۔ یہاں کے بازار، یہاں کی سڑکیں، عمارتیں، سمندر کے کنارے ہوٹل، یہاں کے لوگ، یہاں کی لڑکیاں سب کے سب کہتے ہیں۔ ہمیں دیکھو۔ ہم دیکھنے کی چیز ہیں۔ ہم دیکھنے کی چیز ہیں۔

میں میرین ڈرائیو پر بیٹھا ہوں۔

اور دیکھ رہا ہوں۔

شروع نومبر کی بے حد حسین شام ہے۔ سمندر سے ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔ ہوا تیز اور پُرنم ہے۔ لیکن دھول اس میں نام کو نہیں۔ پوری بمبئی کا یہی حال ہے۔ یہاں دھول مٹی کا دور دور پتہ نہیں۔ سڑکیں ایک دم شفاف اور چکنی رہتی ہیں۔ یہاں کا پانی خراب ہے۔ ایک عجیب سی بُو آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی چکنا بھی ہے۔ اس میں اتنی چکناہٹ ہے کہ مجھے اپنے بالوں میں آج تک تیل ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

میرا عزیز ترین دوست قاضی عارف، مجھے میرین ڈرائیو پر بٹھا کر نماز مغرب پڑھنے چلا گیا

urdunovelist.blogspot.com

ہے۔ یہ اپنا یار بھی عجیب ہے۔ مجھ سے کہہ گیا ہے کہ یہاں کے رنگین ماحول سے لطف اندوز ہوؤں اور خود اللہ اللہ کرنے چلا گیا ہے۔

میرین ڈرائیو کی چھوٹی سی، دور تک چلی گئی دیوار پر، لوگ برابر برابر بیٹھے ہیں۔ ان کی پیٹھ پیچھے سمندر ہے۔ سمندر کی لہریں آہستہ آہستہ دیوار سے ٹکرا رہی ہیں۔ ان کے سامنے ایک چوڑا سا فٹ پاتھ ہے جو دیوار کے ساتھ ساتھ دور تک چلا گیا۔ اس پر رنگ برنگے لباس چل رہے ہیں۔ ننگی ننگی پنڈلیاں ٹہل رہی ہیں۔ کھلے کھلے سینے، لمبے لمبے سانس لے کر تازہ ہوا پھیپھڑوں میں بھر رہے ہیں۔ برہنہ کمریں بل کھا رہی ہیں۔ طرح طرح کی بولیاں سنائی دے رہی ہیں۔ قہقہے اُبل رہے ہیں۔ جو لوگ دیوار پر بیٹھے ہیں۔ وہ سامنے سے گزرنے والی لڑکیوں کے جسموں کا جائزہ لے رہے ہیں۔ شاید وہ آتے ہی اسی غرض سے ہیں۔ بھرے بھرے جسم دیکھنے۔

یہاں کچھ لوگ صرف چہل قدمی کی غرض سے بھی آتے ہیں۔ یہ لوگ آپ کو تیز تیز چلتے نظر آئیں گے اور ان میں زیادہ تر بوڑھے ہوں گے۔

سامنے سے دو پہیوں کی کرسی چلی آ رہی ہے۔ اس میں ادھیڑ عمر عورت بیٹھی ہے۔ شاید اس کی ٹانگیں مفلوج ہیں۔ کرسی اُس کا شوہر چلا رہا ہے جو جھک جھک کر اُس کے کان میں کچھ کہتا جاتا ہے۔ عورت ذرا سا مسکرا دیتی ہے۔ شاید اُس کا شوہر پُرلطف جملے سنا سنا کر اس کی اُداسی دور کرنا چاہتا ہے۔

میرے سامنے سے جوڑے گزر رہے ہیں۔ کسی نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام رکھا ہے۔ کسی نے کمر میں ہاتھ ڈال رکھا ہے۔ کوئی کندھے پر ہاتھ رکھے چلا جا رہا ہے۔ اپنی دُھن میں مگن، غم دنیا سے بے پروا۔ یہاں کوئی اکیلا نہیں۔ کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی کے ساتھ ہے۔ اگر لڑکی نہیں تو دوست، دوست نہیں تو رشتے دار۔ لیکن میں اکیلا بیٹھا ہوں۔ میں جہاں بیٹھا ہوں وہ ذرا سنسان سی جگہ ہے۔ زیادہ آمد و رفت نہیں۔ اِدھر سے وہی لوگ گزر رہے ہیں جو زیمن پوائنٹ جانا چاہتے ہیں یا وہاں سے واپس آ رہے ہیں۔ میری بنچ خالی پڑی ہے۔ میں بنچ پر ہاتھ پھیلائے اوپر آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ بس یوں ہی۔

تب ہی ایک جملہ سنائی دیتا ہے۔

"لو بھئی..... دلیپ کمار بیٹھے ہیں۔"

یہ جملہ انگریزی میں کہا گیا ہے۔ میں سن کر مسکرا دیتا ہوں اور کیا کروں۔ بس اُن تینوں نوجوانوں کو اپنے سامنے سے گزرتا دیکھتا رہتا ہوں۔ پھر میری نظر ایک بنی ٹھنی لڑکی پر پڑتی ہے جو بڑے انداز سے ایک ایک قدم ناپ تول کر آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ایک خوبرو سردار جی ہیں۔ وہ کبھی کبھی اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ لڑکی ساڑھی پہنے ہے اور اس کی ساڑھی ناف پر بندھی ہے۔ سارا پیٹ ننگا ہے۔ لڑکی متناسب جسم کی ہے۔ اب میں اس کے کسے ہوئے کولہے دیکھ رہا ہوں جو ایک خاص انداز میں اُٹھ گر رہے ہیں۔ کولہوں کا یہ ناچ ہزاروں کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ اس کی ساڑھی کمر کے بالکل نیچے جہاں سے کولہوں کا اُبھار شروع ہوتا ہے۔ بندھی ہوئی ہے۔ ساڑھی باندھنے کا یہ نیا فیشن نکلا ہے۔ عورتوں نے اپنے کو زیادہ سے زیادہ ننگا کرنے کا دوسرا نام فیشن رکھ لیا ہے۔ ہم جیسے جیسے کلچرڈ ہوتے جاتے ہیں۔ اتنے ہی پتھروں کے زمانے کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ جب لوگ بالکل ننگے رہا کرتے تھے اور خوش رہتے تھے۔ تاریخ اپنے کو دُہراتی ہے۔ وہ دن زیادہ دور نہیں جب لڑکیوں کے جسم سے لباس بالکل اُتر جائیں گے اور آپ ان کے جسموں پر عجیب عجیب تصویریں اور نقش و نگار بنے دیکھیں گے۔

یہاں کی لڑکیاں زیادہ تر اسکرٹ پہنتی ہیں یا پھر ساڑھی۔ شلوار قمیص تو بہت کم نظر آتے ہیں۔ کچھ عورتیں برقع بھی پہنتی ہیں، لیکن آدھا برقعہ۔ برقع کا صرف نیچے کا حصہ۔ پہلی بار جب میں نے آدھے برقعے والی عورت کو دیکھا تو میں نے سوچا کہ شاید جلدی میں اوپر کا حصہ پہننا بھول گئی ہے۔ لیکن بعد میں احساس ہوا کہ بھول مجھ سے ہوئی ہے اُن سے نہیں۔

کچھ دوستوں کی ٹولی قہقہے لگاتی ہوئی سامنے سے گزر رہی تھی۔ اُن میں سے ایک صاحب بش شرٹ پر ٹائی لگائے ہوئے ہیں۔ جی بش شرٹ پر ٹائی۔

بمبئی آنے سے پہلے لوگوں نے بمبئی کے متعلق باتیں سنا سنا کر مجھے خوب ڈرایا۔ اُدھر فلمیں دیکھ کر بمبئی کے لوگوں سے متعلق جو خاکہ میرے ذہن میں تھا وہ تسلی بخش نہ تھا۔ کبھی کبھی میں سوچنے لگتا کہ میں بمبئی تو جا رہا ہوں کہیں لُٹ لُٹا کر نہ آؤں۔ ان تمام باتوں کے باوجود میں نے فیصلہ کیا کہ بمبئی آنے کی اطلاع قاضی عارف کو نہیں دوں گا بلکہ سیدھا کسی ہوٹل میں ٹھہر جاؤں گا پھر بعد میں

urdunovelist.blogspot.com

اسے فون پر مطلع کردوں گا۔ اس طرح میں نے اپنے کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔

اب جوں جوں بمبئی قریب آتا جارہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہورہا تھا۔ بار بار ہاتھ بٹوے پر جارہا تھا۔ کہیں بٹوا صاف نہ ہوجائے۔ اسٹیشن آئے گا تو پتہ نہیں کیا ہوگا۔ پلیٹ فارم پر غنڈے ٹہل رہے ہوں گے۔ جونیا آدمی جان کر فوراً پیچھے لگ جائیں گے۔ پھر اپنی خیر نہیں، میں کہاں ہوں گا۔ میرا سامان کہاں ہوگا؟ کہیں قتل نہ کردیا جاؤں۔ میرے پاس روپے بھی اچھے خاصے ہیں۔

بمبئی آیا۔ میں دل میں گھبراہٹ اور چہرے پر مصنوعی اطمینان لئے نیچے اُترا۔ قلی سے سامان اُٹھانے کو کہا۔

''کاں جانے کا ساب۔'' اس نے پوچھا۔

''بھائی باہر جانا ہے اور کہاں۔'' میں نے ذرا جھنجھلا کر کہا تاکہ میرے چہرے سے نیا پن فوراً نہ ٹپک پڑے۔ اس سے پیسے طے کئے۔ پھر ٹیکسی میں آبیٹھا۔ ٹیکسی والے سے ''محمد علی روڈ'' بڑے اعتماد کے ساتھ کہا تاکہ وہ نیا نہ سمجھ کر لمبا چکر نہ کٹائے۔ راستے میں ٹیکسی ذرا بھی ہلکی ہوتی تو فوراً پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا کہیں ٹیکسی کے پیچھے سے میرا سامان تو نہیں اُتارا جارہا ہے۔ ان فکر و پریشانی کے لمحوں میں ٹیکسی رکی۔ ہوٹل سامنے تھا میں ٹیکسی سے اُتر کر تیزی سے زینہ چڑھنے لگا۔ منیجر سے کمرے کے متعلق معلوم کیا۔ اس نے کہا۔ ''مل جائے گا۔''

''کسی بیرے کو بھیج کر نیچے سے میرا سامان منگوا لیجئے۔''

''کہاں ہے آپ کا سامان؟''

''نیچے ٹیکسی میں۔''

''نیچے ٹیکسی میں!'' اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں پرلے درجے کا احمق ہوں اور پھر فوراً ہی مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوگیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ سامان تو پتہ نہیں ٹیکسی والا کہاں لے کر جاچکا ہوگا۔ میں اندھا دھند سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے آیا۔ ٹیکسی والا کھڑکی سے لگا بڑے اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا۔ میری جان میں جان آئی۔

میرے برابر ایک موٹی سی عورت اور اس کا دبلا سا شوہر آبیٹھے ہیں۔ پتہ نہیں کس زبان میں زور سے باتیں کررہے ہیں۔ شاید مراٹھی ہے۔ ان کا بچہ چاٹ والے کی طرف اشارہ کرکے مچل رہا

ہے۔ چاٹ والا ایک میلی سی قمیص اور پھٹا سا خاکی نیکر پہنے ہے۔ یہ ضرور ان بوسیدہ سے جھونپڑوں میں رہتا ہوگا جہاں خواجہ احمد عباس کی اکثر فلمیں جنم لیتی ہیں۔ یہ جھونپڑے میں نے دیکھے ہیں کتنے خستہ۔ ذرا سی اُنگلی چھلا دو تو پھونس مٹی ہوکر نیچے گر پڑے۔ ان ہی جھونپڑوں میں لوگ بمبئی کی خطرناک برسات بھی گزار دیتے ہیں۔ خدا کی پناہ۔

''بیوی اور مکان کے ڈائیلاگ راجندر سنگھ بیدی کے ہیں۔''

یہ جملہ ان دو لڑکوں کی طرف سے آیا تھا جو میری بینچ کے سامنے ہی دیوار پر آبیٹھے تھے۔ دونوں لڑکے کم عمر ہی تھے۔

راجندر سنگھ بیدی جنہیں فلمی دنیا دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی ہے اور وہ خاموشی سے لٹ رہے ہیں۔

میں اور میرا دوست راجندر سنگھ بیدی کے سادا مگر خوبصورت ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ دیوالی کا دن ہے۔ بیدی ہمارے آنے سے پہلے کہانی لکھ رہے تھے۔ ہمارے آنے کی خبر سنتے ہی فوراً اُٹھ کر باہر چلے آئے ہیں۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور اپنے بزرگ دوست قاضی عبدالستار کا ناول ''شب گزیدہ'' جو انہوں نے بیدی کیلئے بھجوایا تھا، پیش کیا۔ دیکھ کر خوش ہوئے۔ پھر باتیں شروع ہوئیں۔ دنیا بھر کی باتیں ادب سے متعلق، کچھ ان کی کہانیوں کے بارے میں، کچھ علی گڑھ کے لوگوں خصوصاً آل احمد سرور کے بارے میں جو بیدی کے بہترین دوست ہیں، کچھ بمبئی کے ادیبوں کے متعلق۔

میرے کہنے پر بیدی وہ صفحات اُٹھا لائے جن پر وہ کہانی لکھ رہے تھے۔ چودہ پندرہ صفحات لیکن ان میں صرف دو صفحے ہی کام کے تھے۔ بیدی اس عمر میں بھی کہانیاں کتنی محنت سے لکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں اور لکھ لکھ کر کاٹتے رہتے ہیں جب تک مطمئن نہیں ہوجاتے۔ انہوں نے یہ دو صفحات سنائے اور آگے کی کہانی زبانی بتادی۔ اس کہانی کا نام ''جنازہ کہاں ہے'' رکھا ہے۔ بڑی پیاری کہانی ہے۔ پھر میں نے اپنی کہانی ''پپڑی جمے ہونٹ'' سنائی۔ بڑی دلچسپی سے سنی اور پھر اتنی ہی دلچسپی کے ساتھ اس پر تبصرہ کیا۔ بیدی باہر تک ہم لوگوں کو چھوڑنے آئے۔ باہر آکر گھڑی پر نظر پڑی تو سوا دو بج رہے تھے۔ خاصی دیر ہوگئی تھی۔ ہم یہاں سوا گیارہ بجے آئے تھے۔ یعنی تین گھنٹے

urdunovelist.blogspot.com

بیٹھے اور ذرا بھی احساس نہ ہوا۔

بیدی جیسے مخلص ادیب میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔ درمیانہ قد، مضبوط جسم کے بیدی۔ جن کی آنکھوں سے فکر اور چہرے سے بے پناہ سنجیدگی ٹپکتی ہے۔ ان کی مسکراہٹ میں کشش ہے جو سکھ ہیں لیکن پان بھی کھاتے ہیں اور شراب بھی پیتے ہیں اور اپنی داڑھی مونچھوں پر قینچی بھی لگاتے ہیں۔ یہ سب کرتے ہیں لیکن پھر بھی ان کا دل دُکھتا ہے۔ وہ اپنے خیالات کے لحاظ سے سادھو بھی ہیں اور ایک جدید آدمی بھی۔ وہ خدا کو مانتے ہیں لیکن اس طرح نہیں جس طرح پنڈت مانتے ہیں۔ بیدی جتنے اچھے ادیب ہیں اتنے ہی اچھے انسان بھی اور ایسا بہت کم ہوتا ہے۔

ہمارے مولانا اب تک نماز پڑھ کر واپس نہیں لوٹے ہیں حالانکہ شام کی سیاہی خاصی گہری ہوگئی ہے۔ ہوا میں کچھ خنکی آگئی ہے۔ میں اپنے بدن میں کبھی کبھی جھرجھری سی محسوس کرتا ہوں۔

اُس دن بھی ایسی ہی شام تھی جب میں قرۃ العین حیدر سے ملنے جارہا تھا۔ میں اور قاضی عارف بس اسٹاپ پر کھڑے اپنی محبوبہ کا انتظار کررہے تھے۔ لیکن وہ تھی کہ آکر ہی نہیں دے رہی تھی۔ لوگ بڑے صبر وسکون سے لائن میں کھڑے تھے۔ لائن بھی خاصی لمبی تھی۔ لوگ آتے جارہے تھے اور لائن میں کھڑے ہوتے جارہے تھے کوئی شخص لائن توڑ کر آگے جگہ لینے کی کوشش نہیں کررہا تھا۔ یہ بات میں نے ہر جگہ دیکھی۔ چاہے وہ ریلوے ٹکٹ کی کھڑکی ہو یا سینما کے ٹکٹ یا کوئی اور جگہ جہاں لائن لگانے کی ضرورت پڑتی ہو، لوگ بڑے صبر وسکون سے کھڑے رہتے ہیں اور کوئی بھی لائن توڑنے کی کوشش نہیں کرتا۔

خدا خدا کر کے بس آئی اور ہمیں جگہ بھی مل گئی۔ ہم سب سے پیچھے بیٹھے کیونکہ بس میں بیٹھنے سے میری طبیعت خراب ہوجاتی ہے۔ اس کی وجہ پیٹرول یا ڈیزل کی بُو ہے۔ میرے برابر کوئی صاحب تھے اور ان کے برابر ایک خوبصورت سا لڑکا اور لڑکے کے برابر بالکل کونے میں جوان لڑکی۔ وہ لڑکی پیار بھری نظروں سے اپنے برابر بیٹھے ہوئے لڑکے کو دیکھتی تھی اور بار بار اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی تھی۔ لڑکا ہر بار آہستہ سے ہاتھ کھینچ لیتا تھا۔ میں بہت دیر تک ہاتھوں کے اس کھیل کو دیکھتا رہا۔

وہ بڑی بڑی مونچھوں والا کنڈیکٹر پتہ نہیں کس کو ڈانٹ رہا تھا۔ بس چند لمحوں کے لئے ایک اسٹاپ پر رکی تھی۔ اگر آپ چاہیں کہ بمبئی کے کسی چھوٹے آدمی کو چاہے وہ کنڈیکٹر ہو یا ٹیکسی

ڈرائیور یا اسٹیشن کا قلی ہو۔ ڈانٹ ڈپٹ کر اپنے رعب میں لے لیں ناممکن ہے۔ اگر آپ اس سے ایک بات کہیں گے تو وہ آپ کو سو سنائے گا اور بار بار قانون اور اصولوں کا حوالہ دے گا۔ یہاں کا ہر چھوٹا آدمی اصول اور قانون کے مطابق بات کرتا ہے۔ اس لئے آپ جب اُن سے بات کریں تو بات کرنے سے پہلے اپنی نوابانہ ذہنیت کو اپنے بٹوے میں رکھ لیجئے گا۔ یہاں سب برابر ہیں۔

میں کچھ خوفزدہ سا تھا۔ اس لئے کہ میں قرۃ العین حیدر سے ملنے جارہا تھا۔ بیدی سے ملنے کیلئے جاتے وقت مجھ پر اس طرح کا کوئی خوف نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علی گڑھ میں ان کے بارے میں خاصی افواہیں سن چکا تھا کہ کسی سے بات نہیں کرتیں۔ بے حد ریزرو ہیں۔ مغرور ہیں۔ کوئی بات کرنے کی کوشش کرتا ہے تو روڈلی جواب دیتی ہیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ آب وہوا کی تبدیلی کی وجہ سے میرا گلا بیٹھ گیا تھا، میں سوچ رہا تھا کہ پھنسے ہوئے بانس کی سی آواز سے بات کس طرح کروں گا۔ یہی سوچ سوچ کر میں خوفزدہ سا ہو رہا تھا اور دھیان بٹانے کیلئے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

اب ہاتھوں کا کھیل ختم ہوچکا تھا۔ لڑکے کا ہاتھ لڑکی کے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ کی سب سے بڑی اُنگلی لڑکی کا برہنہ گھٹنا سہلا رہی تھی۔ لڑکی نے اس کا ہاتھ دبوچ رکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے بلی نے کسی شریر چوہے کو اپنے پنجے میں داب رکھا ہو اور وہ اُس سے نجات پانے کے لئے سر توڑ کوشش کررہا ہو۔

ہم ''آشا محل'' کے سامنے کھڑے ہیں۔ میرا دل دھاڑ دھاڑ کررہا ہے۔ عینی صاحبہ کا فلیٹ گراؤنڈ فلور پر ہے۔ آہستہ سے کال بیل دبائی۔ کچھ دیر بعد ایک بڑھیا نے منہ چمکایا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ عینی صاحبہ گھر پر موجود ہیں۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوکر چاروں طرف کا جائزہ لیا، دیواروں پر چند تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ جو غالباً مس حیدر کی بنائی ہوئی تھیں۔ ایک فل سائز کا شیلف جس میں کتابیں لگی ہوئی تھیں جو زیادہ تر انگریزی کی تھیں۔ ایک چھوٹی سی میز جس پر تصویریں بنانے کا سامان۔ ایک چھوٹی سی چوکی جس پر کاغذات اور کتابیں بے ترتیب پڑے تھے۔ چند کرسیاں، ایک مونڈھا۔ ایک تخت۔ ان کا ڈرائنگ روم دیکھ کر مجھے قاضی عبدالستار کا ڈرائنگ روم یاد آگیا۔ وہاں بھی اس طرح کی بے ترتیبی نظر آتی ہے۔

urdunovelist.blogspot.com

قرۃ العین حیدر تشریف لائیں۔ ساڑھی میں ملبوس، لمبی سی، دبلی ہیں اس لئے مزید لمبی لگتی ہیں جس کے مقابلے میں چہرہ بھاری ہے۔ بالوں میں کہیں کہیں چاندی کے تار جھلک رہے تھے۔

مس حیدر سے بڑے گھریلو انداز میں باتیں ہوئیں، ادب کے سلسلے میں زیادہ گفتگو نہ ہو سکی۔ کچھ قاضی عبدالستار کے متعلق باتیں ہوئیں، علی گڑھ کے متعلق پوچھا کون کون لوگ ہیں کیا کر رہے ہیں۔ میرے گھریلو حالات کے بارے میں معلوم کیا۔ انہیں ہم نوجوانوں کی بڑی فکر ہے۔ ہم کیا کر رہے ہیں کیا کریں گے۔ ہمارا مستقبل کیا ہے۔ اس سلسلے میں بڑی دردمندی سے باتیں کرتی رہیں۔ کچھ سیاسی گفتگو ہوئی، کچھ اردو رسائل کا ذکر چلا۔ اردو کے متعلق باتیں ہوئیں اور پھر نہ جانے اِدھر اُدھر کی کتنی باتیں زیر بحث آئیں۔

مس حیدر بڑے بے تکلف انداز میں باتیں کر رہی تھیں۔ وہ تخت پر دیوار سے ٹیک لگائے گھٹنے پر کہنی رکھے بیٹھی تھیں۔ کبھی ہاتھ میں چشمہ لے لیتی تھیں اور کبھی ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھ لیتی تھیں۔ ذرا ذرا سی بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔ لیکن بے آواز قہقہہ، گھٹا گھٹا سا قہقہہ جب وہ ہنستی تھیں تو اُن کے سفید دانت چمکنے لگتے تھے۔ آنکھیں بند ہو جاتی تھیں اور جسم ہچکولے لینے لگتا تھا۔ مس حیدر کی آنکھیں بڑی پرکشش ہیں۔ بڑی بڑی جاگتی آنکھیں۔ بلکہ ساحرانہ آنکھیں اور بقول میرے دوست کے ''قاتل آنکھیں۔''

مس حیدر سے باتیں کرتے وقت میرا سارا خوف کافور ہو چکا تھا۔ میں نے جو سوچا تھا وہ اس سے بالکل مختلف نکلیں۔ نہایت خلیق اور ملنسار، دردمند، ایک دم مشرقی عورت، وہی باتیں، وہی انداز، کھنکتے جاموں کی محفل سے نفرت، اپنی تہذیب سے اُلفت۔

''کیوں بھئی۔ بور تو نہیں ہوئے۔'' کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں اچھل پڑا۔ قاضی عارف نماز پڑھ کر آ گیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں بھئی۔ میں تو لطف اندوز ہوتا رہا۔''

پھر ہم لوگوں نے ناریل کا پانی پیا اور ''ہینگنگ گارڈن'' کی طرف بڑھنے لگے۔ ہینگنگ گارڈن کیونکہ پیدل گئے تھے۔ اس لئے پہنچتے پہنچتے خاصی دیر ہو گئی۔ عشاء کا وقت ہو گیا۔ مولانا پھر نماز پڑھنے نکل گئے۔

ہینگنگ گارڈن تقریباً سنسان ہو چکا ہے۔ کہیں کہیں اکا دکا آدمی نظر آ رہے ہیں۔ میں جہاں کھڑا ہوں۔ وہاں پر پانچ منٹ بعد کوئی نہ کوئی آ جاتا ہے۔ کبھی کوئی فیملی۔ کبھی کوئی جوڑا، کبھی بچے۔ یہاں سے بمبئی کا بڑی دور تک نظارہ ہوتا ہے۔ رات کی سیاہی کے پس منظر میں اونچی اونچی عمارتیں اور ان بلڈنگوں کی کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی روشنی عجیب منظر پیش کر رہی ہے۔ میرین ڈرائیو کو گھیرے میں لئے بتیاں، کسی رانی کے ہار کی طرح نظر آ رہی ہیں۔ دور تک چلی گئی، کاروں کی قطار اور ان کی مدھم چمکتی ہوئی روشنیاں بڑی متاثر کن ہیں۔ میں اس دلفریب نظارے میں کھو سا گیا ہوں۔ تب ہی کسی کھسر پسر کی آواز سے چونک جاتا ہوں۔ میرے برابر ایک جوڑا آ کھڑا ہوا ہے۔ دونوں بہت آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ لڑکا بار بار میری طرف دیکھتا ہے۔ شاید اسے میری موجودگی کھل رہی ہے۔ میں وہاں سے ہٹ کر، جوتے نما مکان کی طرف جانے لگتا ہوں جو سامنے ہی ہے۔ تھوڑا آگے چل کر جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو لڑکا، لڑکی پر چھایا ہوا ہوتا ہے۔ میں مسکرا دیتا ہوں۔

بمبئی تھیٹر دیکھ کر گھر لوٹے تو ایک بج رہا تھا۔ میں اور قاضی عارف یوں ہی تھوڑی دیر کے لئے ٹیرس پر کھڑے ہو گئے۔ ساری بلڈنگیں سو رہی تھیں۔ اچانک ایک کھڑکی جاگی۔ کھڑکی کے تھوڑے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ اندر روشنی میں ایک لڑکی اپنے کپڑے اُتار رہی تھی۔ ہمیں اس کا اوپری جسم نظر آ رہا تھا۔ کپڑے اُتار کر وہ نیچے جھک گئی تھی۔ شاید وہ نہا رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ رات میں ایک بجے نہانے کی کیا تک تھی۔ اس لڑکی کو شاید نہیں معلوم تھا کہ اس آدھی رات میں بھی کوئی اُس کو دیکھ سکتا ہے۔ ورنہ وہ کھڑکی کے پٹ ضرور بند کر لیتی۔

لیکن فارس روڈ پر کھڑی ہونے والی عورتوں کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان کے جسموں کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ پھر بھی ذرا نہیں جھینپتی اور اپنے جسموں کو زیادہ سے زیادہ ننگا کر کے دکھانا چاہتی ہیں۔

فارس روڈ کے دونوں طرف دکانیں سی بنی ہیں۔ ہر دکان میں تختے لگا کر اسے دو یا تین حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے بدنما شوکیسوں میں نیم عریاں جسم کھڑے ہیں۔ کوئی پینٹ شرٹ میں ہے، کوئی اسکرٹ میں ہے، کسی نے صرف انگیہ اور جانگیہ پہن رکھا ہے تو کسی نے پیٹی کوٹ اور چھوٹا سا بلاؤز، کوئی ٹانگ اُٹھائے کھڑی ہے تو کوئی ہاتھ اُٹھائے۔ کوئی انگڑائی کے

urdunovelist.blogspot.com

انداز میں کھڑی ہے تو کوئی پیٹھ موڑے صرف کولہے دکھا رہی ہے۔ کوئی موٹی ہے تو کوئی چھوٹی ہے۔ کوئی دُبلی ہے تو کوئی لمبی ہے۔ سب کے چہرے رنگے ہوئے ہیں۔

ان دکانوں کے اوپر کھڑکیاں ہیں۔ ان میں اسی طرح کے جسم اور چہرے لٹکے ہیں۔ سڑک کے دونوں کناروں پر خاصی بھیڑ ہے۔ لوگ چل رہے ہیں، دیکھ رہے ہیں، میں بھی چل رہا ہوں۔ گردن جھکائے نیچی نیچی نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔

میں اس وقت خالی الذہن ہوں۔ میرے دل میں کوئی جذبہ نہیں، نہ مجھے ان طوائفوں سے ہمدردی ہو رہی ہے اور نہ ہی اس ماحول سے نفرت۔ کیا یہ عورتیں ہیں، ویسی ہی عورتیں جو ہمارے گھروں میں رہتی ہیں۔ ہمارے ساتھ رہتی ہیں۔

''اے بابو۔''

کوئی مجھے مخاطب کرنا چاہتی ہے۔ میں نہیں دیکھتا۔

''یہ چشمہ دن کا ہے یا رات کا۔'' وہی طوائف میرے بازو پر ہاتھ رکھ دیتی ہے۔ میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ اتنی بھی ہمت نہیں رہتی کہ اس کو مڑ کر بھی دیکھ سکوں۔ اس کے نرم ہاتھ کا لمس مجھے اب تک یاد ہے اور جانے کب تک یاد رہے گا۔ یہ لمس تو بالکل عورتوں کا سا ہے۔ بالکل گھریلو عورتوں کا سا۔ یہ سب عورتیں ہیں، حوا کی بیٹیاں۔ انہیں کس نے ایسا بنا دیا۔ یہ کیوں ایسی بن گئیں۔

ہم بمبئی تھیٹر کی پینسٹھ پیسے والی کلاس میں بیٹھے ہیں۔ ہمارے سامنے اسٹیج پر طوائفیں ناچ رہی ہیں۔ ہماری کلاس میں زیادہ تر لوگ بینچوں پر پڑے ہوئے بے خبر سو رہے ہیں۔ کچھ لوگ جو جاگ رہے ہیں، وہ اچھل اچھل کر داد دے رہے ہیں۔ فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس میں اکا دکا آدمی نظر آ رہے ہیں۔ یہ بمبئی تھیٹر، کبھی پرتھوی راج کا تھا۔ اسی تھیٹر سے راج کپور، دلیپ کمار اور اشوک کمار جیسے بڑے ستارے منسلک رہے ہیں۔ آج وہی تھیٹر طوائفوں کی اچھل کود کا اڈہ بنا ہوا ہے۔ میں طوائفوں کے ناچ سے زیادہ اس ڈھولکیے میں دلچسپی لے رہا ہوں جو گردن ٹیڑھی کر کے بڑے انداز میں ڈھولک بجا رہا ہے۔ اس کی ڈھولک بڑی جلدی ڈھیلی ہو جاتی ہے وہ فوراً اسے کسنے کیلئے ہتھوڑے کی طرف دوڑتا ہے تب تک طبلے والا تھاپ دیتا رہتا ہے۔ ڈھولک کس کر پھر میدان میں آ جاتا ہے اور طبلے والے کو مجبوراً اپنے ہاتھ روکنے پڑتے ہیں۔ اس کے انداز دیکھ دیکھ کر مجھے بڑی

ہنسی آ رہی ہے۔ قاضی عارف بھی بڑا لطف لے رہا ہے۔

''اُٹھ بے۔'' ایک آواز آتی ہے۔

ہم دونوں چونک پڑتے ہیں۔ مڑ کر دیکھتے ہیں۔ ایک کالا سا گول چہرے والا آدمی جو صورت سے دادا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے گلے میں سرخ رومال اور سر پر گول ٹوپی ہے۔ وہ بنچ پر سوئے ہوئے ایک آدمی کو اُٹھا رہا ہے۔ شاید تھیٹر کا وقت ختم ہونے والا ہے اور سب لوگ تو اُٹھ گئے ہیں مگر بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ یہ آدمی بڑے اطمینان سے سو رہا ہے۔ اُٹھائے اُٹھتا ہی نہیں۔ دادا کچھ کہے بغیر باہر چلا جاتا ہے۔ دو منٹ کے بعد ہی واپس آ جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا ڈونگا ہے۔ وہ بغیر کسی جھجک کے سارا پانی اس پر اُلٹ دیتا ہے۔ سوتا ہوا آدمی آنکھیں ملتا ہوا اُٹھتا ہے۔

''اُٹھو بیٹا۔ تھیٹر کا ٹیم ختم ہو رہا ہے۔''

دن بھر سخت محنت و مشقت کرتے ہیں۔ یہاں تفریح کیلئے آتے ہیں لیکن تھکن فوراً نیند کو آواز دیتی ہے اور وہ طوائفوں کے ٹھمکے دیکھتے دیکھتے نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

ہم ہزاروں فٹ پاتھ پر سوتے ہوئے لوگوں کے درمیان سے گزر رہے ہیں۔ میں بڑی احتیاط سے بچتا بچاتا چل رہا ہوں۔ کہیں میرا پاؤں کسی کے سر سے نہ ٹکرا جائے۔ اچھے خاصے بستروں پر اچھے خاصے لوگ، فٹ پاتھ پر سو رہے ہیں۔ ان کے پاس سب کچھ ہے۔ اگر نہیں تو صرف گھر نہیں۔

میری نظر دور تک پڑتی ہے۔ اور میں رُک جاتا ہوں۔ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک چادر میں کوئی چیز بڑے زور زور سے ہلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ میں قاضی عارف کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہوں۔ وہ بھی مسکرا دیتا ہے۔

''یہ فٹ پاتھ کی دنیا ہے یار۔'' وہ کہتا ہے۔

وہ پُر جوش جوڑا جا چکا ہے۔ آسمان پر کچھ بادل سے ہو رہے ہیں۔ شاید بارش ہونے والی ہے۔ میں خاموش کھڑا اس دلفریب منظر کو دیکھ رہا ہوں جو میری آنکھوں میں جذب ہوا جاتا ہے۔ میں یہاں اس وقت تک کھڑا رہوں گا جب تک قاضی عارف عشاء کی نماز پڑھ کر واپس نہیں آئے گا۔ نہ جانے وہ کب آئے گا۔

□□

urdunovelist.blogspot.com

پپڑی جمے ہونٹ

''علی گڑھ نیوز'' کی اس خبر نے سارے شہر میں کھلبلی مچادی تھی۔ یوں خبر بھی کچھ کم حیرت انگیز نہ تھی۔ علی گڑھ نیوز کے دروازے پر اس وقت خاصی بھیڑ تھی، لوگ ایک ہی بات پوچھ رہے تھے۔

''کیا یہ خبر صحیح ہے؟''

''جی ہاں، یہ خبر صحیح ہے۔'' بے چارہ ایڈیٹر اس جملے کو دُہراتا دُہراتا عاجز آ گیا تھا۔

بار بار فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

فون کرنے والے صرف ایک ہی بات پوچھ رہے تھے۔

''کیا یہ خبر صحیح ہے۔''

''جی ہاں، یہ خبر صحیح ہے۔'' ایڈیٹر اب جھنجھلا کر جواب دے رہا تھا۔

لوگ بار بار اس لئے پوچھ رہے تھے کہ اُن کو اس خبر پر کسی طرح یقین نہیں آ رہا تھا، وہ اس کو اخبار کی اشاعت بڑھانے کا ایک ہتھکنڈا سمجھ رہے تھے اور ایڈیٹر اس لئے جھنجھلا رہا تھا کہ لوگوں کو اس کی چھاپی ہوئی خبر پر یقین کیوں نہیں، جب کہ اس نے پوری تصدیق کر کے خبر چھاپی تھی۔

خبر شہر کی جامع مسجد کے امام جناب اختر حسین انصاری کے متعلق تھی۔ اختر حسین انصاری جن کی عمر ساٹھ سال سے کسی طرح کم نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود اُن کے بدن میں توانائی تھی، وہ اب

بھی سینہ تان کر چلتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ عاجزی سے ان کی گردن جھکی رہتی تھی۔ رنگ گورا، گالوں پر ہلکی ہلکی سرخی، بھرا ہوا چہرہ، چہرے پر دو بڑی بڑی جاگتی آنکھیں، جنہیں اب تک شیشوں کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ سفید بالوں والی خوبصورت داڑھی۔

وہ بے حد نیک آدمی تھے اور اپنی پُر خلوص طبیعت کیلئے بہت مشہور تھے۔

کل رات وہ چھت پر سو رہے تھے۔ قریب ہی اُن کی بیوی کا پلنگ تھا کہ ٹھیک بارہ بجے چھت پر ایک ہنڈولا اُترا، اس میں ایک خوبصورت پری بیٹھی ہوئی تھی، اس پری نے اپنے ساتھ لائے ہوئے غلاموں کو اشارہ کیا، اشارہ پاتے ہی انہوں نے امام صاحب کو مع پلنگ اُٹھا لیا اور اُس پلنگ کو ہنڈولے میں رکھ دیا، امام صاحب کی بیوی نے یہ پورا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ بول نہ سکیں، وہ اسے جاگتی آنکھوں کا خواب سمجھتی رہیں، جب ہنڈولا آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور امام صاحب کا پلنگ بھی برابر میں نظر نہ آیا تو انہوں نے اپنے رخسار پر بڑے زور سے طمانچہ مارا، طمانچے کی آواز ہوئی اور ساتھ ہی انہوں نے تکلیف محسوس کی، پھر اُٹھ کر وہ کھڑی ہو گئیں اور چلانے لگیں۔ لیکن اب چلانے سے کیا ہوتا تھا۔ پری امام صاحب کو اُڑا کر لے جا چکی تھی۔

یہ تھا وہ واقعہ جس کو خبر بنا کر ''علی گڑھ نیوز'' میں شائع کیا گیا تھا، بات واقعی حیرت انگیز تھی۔ لیکن تھی سچی۔ لوگوں کو یقین نہیں آ رہا تھا تو اس میں لوگوں کا قصور نہیں تھا۔ قصور اس واقعے کا تھا۔ جو اس بیسویں صدی میں پیش آیا تھا۔

دن خاصا چڑھ گیا تھا، ہر طرف اس خبر کا چرچا تھا۔

''ارے تم نے سنا۔''

''ہاں یار، بڑی عجیب بات ہے، امام صاحب کو پری اُڑا کر لے گئی۔''

''کیا اب تک پریوں کا وجود ہے؟''

''اس واقعے سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ پریاں ابھی موجود ہیں۔ ذرا تم سنبھل کر سونا کہیں تمہیں نہ اُڑا کر لے جائے۔''

''یار مجھے لے جائے تو مزہ آ جائے، وہ کم بخت عاشق ہوئی تو ایک نمازی پرہیز گار پر، جو بوڑھا بھی تھا، ارے ہم جیسے کڑیل جوانوں کو لے جاتی تو.....''

urdunovels1.blogspot.com

''ہاں یہ تو ہے..... مگر یار وہ امام صاحب کو لے کہاں گئی ہوگی؟''

''کوہ قاف اور کہاں؟''

''معلوم نہیں وہ کس حال میں ہوں گے؟''

''ابے عیش کر رہے ہوں گے عیش۔''

☆.....☆.....☆

ایک خوبصورت محل کے سجے سجائے کمرے میں ریشم جیسے ملائم بستر پر وہ آنکھیں موندے پڑے تھے۔ کمرے میں اُن کے علاوہ کوئی اور نہ تھا، لیکن اس کے باوجود وقفے وقفے سے ان کی داڑھی کے ریشمیں بال اُڑنے لگتے جیسے کوئی پاس ہی بیٹھا بہت آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہا ہو۔

اختر حسین انصاری صبح سے ہی بے ہوش پڑے تھے۔ پری نے راستے ہی میں ان کو بے ہوشی کی دوا سنگھا دی تھی، جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، دوا کا اثر کم ہو رہا تھا اور اب وہ کچھ منٹوں کے بعد ہوش میں آنے والے ہی تھے۔ کمرے کی پوری فضا معطر تھی، اس کے ساتھ ہی خوشگوار اندھیرا ابھی پھیلا ہوا تھا۔

اچانک اختر حسین انصاری کے جسم میں حرکت ہوئی، اُن کا ہاتھ پہلو سے اُٹھ کر سینے پر چلا گیا۔ ہونٹ کھلے آواز نکلی۔

''یا اللہ!''

آنکھیں بند ہی رہیں، پھر پپوٹوں کو حرکت ہوئی، اختر صاحب نے سیدھے ہاتھ کی طرف گردن موڑ کر تکیے کو دیکھا، وہاں جانماز کے بجائے کشمشی رنگ کی مخمل دکھائی دی۔

اللہ کے نیک بندے کا دل گھبرایا اور انہیں خود بہ خود کسی خطرے کا احساس ہو گیا، وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔

''یا اللہ..... یہ کیا ماجرا ہے؟'' دل نے سوال کیا۔

تب ہی کمرے میں ایک باریک سی مترنم ہنسی گونجی۔

''کون؟'' اختر حسین نے پرچھائیں سے پوچھا۔

جواب میں وہی باریک مترنم ہنسی۔

اختر حسین نے دل ہی دل میں کئی آیتیں پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیں، تب انہوں نے اطمینان قلب محسوس کیا۔ چہرے پر کسی قدر سکون کے آثار نظر آنے لگے۔

''تو کون ہے بول؟'' اختر حسین نے پوچھا۔

پھر وہی باریک مترنم ہنسی۔

''تو کون ہے بتا..... اور اپنے آپ کو ظاہر کر..... مجھے تو کوئی خبیث روح معلوم ہوتی ہے۔ بتا یہ کون سا مقام ہے..... تو مجھے کہاں لے آئی ہے..... اور تیری غرض کیا ہے؟''

کمرے میں کچھ پرچھائیاں سی لہرائیں اور پھر ایک رس بھری آواز سنائی دی۔

''اختر حسین صاحب، آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''پریشان وہ ہوتے ہیں جنہیں خدا پر بھروسا نہیں ہوتا۔'' اختر حسین نے بات کاٹی۔

''خیر..... میں جو کوئی بھی ہوں..... اپنے آپ کو مناسب وقت پر ظاہر کروں گی..... فی الحال آپ اطمینان سے لیٹیں..... جس چیز کی خواہش ہو حکم کریں..... حکم کی فوراً تعمیل کی جائے گی۔''

''تم مجھ سے چاہتی کیا ہو۔''

''فی الحال کچھ نہیں..... ابھی آپ نہا لیجئے۔ ناشتا کر کے آرام فرمائیے..... پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔''

پھر نہ جانے کیوں اختر حسین انصاری کو اطمینان سا ہو گیا..... انہیں محسوس ہوا جیسے اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔

''آئیے۔'' آواز آئی۔

اور وہ آواز کے ساتھ ہی اُٹھ گئے۔

جب وہ نہا دھو کر واپس آئے تو انہوں نے مسہری پر ایک بہترین جوڑا رکھا دیکھا، انہوں نے اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور کہنیاں تکیے سے ٹیک کر لیٹ سے گئے۔

''کپڑے بدل لیجئے۔'' وہی آواز آئی۔

''نہیں..... شکریہ..... میرے اپنے ہی کپڑے ٹھیک ہیں۔'' اختر حسین نے اتنے اعتماد سے کہا کہ آواز اصرار نہ کر سکی۔ جوڑا فوراً غائب ہو گیا۔ مسہری کے قریب ایک چھوٹی سی گول میز آ لگی۔

urdunovelist.blogspot.com

اس پر ناشتا چُنا ہوا تھا۔

اختر صاحب نے ناشتے کو غور سے دیکھا، مگر وہاں انہیں اپنے مطلب کی کوئی چیز نظر نہ آئی۔

''ہچکچاہٹ کیوں؟''

''اپنے اس ناشتے کو ہٹالو..... مجھے صرف دل روٹی چاہئے۔''

ناشتا ہٹ گیا اور اس کی جگہ دال روٹی آ گئی، ناشتے کے بعد اختر صاحب کو حقے کی طلب ہوئی .....ابھی وہ یہ سوچ ہی رہے تھے کہ چونک پڑے سامنے تازہ بھرا ہوا حقہ رکھا تھا۔ حقہ گڑگڑانے کے بعد اُن پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اور وہ اپنا ہاتھ سر کے نیچے اور ایک ٹانگ گھٹنے پر رکھے رکھے سو گئے۔ دوپہر کو آنکھ کھلی، ظہر کا وقت ہو چکا تھا، وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ وضو کیا، نماز پڑھنے کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھے کہ ایک کونے میں چوکی اور چوکی پر جانماز رکھی نظر آئی، نماز پڑھی، نماز پڑھنے کے بعد انہوں نے ایک عجیب طرح کا سکون محسوس کیا، ایسا سکون جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

نماز پڑھ کر وہ کمرے میں ٹہلنے لگے۔ تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا، اس دروازے میں سے انہیں پھلوں سے لدا ہوا ایک خوبصورت باغ نظر آیا، وہ اس باغ کی طرف لپکے۔ تھوڑی ہی دیر ٹہلے ہوں گے کہ اُن پر غنودگی طاری ہونے لگی اور وہ وہیں گھاس کے فرش پر لیٹ گئے۔ لیٹتے ہی سو گئے۔ مغرب کے وقت آنکھ کھلی، نماز پڑھنے کے بعد کھانا ملا۔ حقہ پیا اور پھر سوچنے لگے کہ آج مجھے اتنی نیند کیوں آ رہی ہے اور یہ سوچتے ہی سوچتے ان کی آنکھوں پر خواب کے دبیز پردے پڑ گئے۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد وہ بیٹھے ہی تھے کہ کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی۔ یہ روشنی کہاں سے آ رہی تھی اور کیسی تھی، انہیں کچھ معلوم نہ تھا۔ پھر آہستہ آہستہ روشنی کم ہونے لگی۔ روشنی کے کم ہونے کے ساتھ ساتھ اختر صاحب کی آنکھیں کھلنے لگیں، اس وقت کمرے میں بڑی مدھم روشنی تھی جیسے چھ سات شمعیں جل رہی ہوں۔ پھر کمرے کا ایک دروازہ کھلا اور اس میں رنگین لباس لہرایا۔ اختر صاحب کی آنکھیں ذرا اور کھل گئیں۔

کمرے میں داخل ہونے والی ایک نوجوان رسیلی لڑکی تھی، جس کے باریک لباس سے اس کا جسم پھٹا پڑتا تھا۔ اختر صاحب نے اسے دیکھتے ہی لاحول کا ایک زوردار نعرہ لگایا۔

وہ بڑے کافرانہ انداز میں مسکرائی اور رقص کے انداز میں ہاتھ اُٹھا کر ہوش رُبا انگڑائی لی۔ اختر صاحب تاب نہ لا سکے، انہوں نے منہ پھیر لیا اور جلدی جلدی آیتیں پڑھنے لگے۔

''اوہ..... آپ نے منہ پھیر لیا..... آپ نے تو مجھے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی..... لیجئے اب میں نے خود کو ظاہر کر دیا..... مجھے جی بھر کر دیکھئے..... میرا نام گل بانو ہے..... میں ایک پری ہوں اور آپ کی کنیز..... اس وقت آپ میرے محل میں ہیں۔ یہ محل کوہ قاف کی سب سے بلند چوٹی پر آباد ہے، میرا خیال ہے کہ میں نے صبح پوچھے جانے والے ہر سوال کا جواب دے دیا ہے۔''

''تم ایک غیر مرد کے سامنے اتنے باریک لباس میں کھڑی ہو..... تمہیں شرم نہیں آتی؟''

جواب میں مترنم ہنسی گونجی۔

''اور اوپر سے ہنستی ہے..... بے حیا کہیں کی۔''

''اختر صاحب..... ناراض نہ ہوں..... میری طرف دیکھئے..... میں نے لباس بدل لیا ہے۔''

اختر صاحب نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور فوراً ہی استغفار پڑھتے ہوئے اپنا منہ چھپا لیا۔

گل بانو بالکل برہنہ کھڑی تھی۔

پھر وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مسہری کے پاس آ کھڑی ہوئی اور اپنا ہاتھ اختر صاحب کے سر کے سفید بالوں پر پھیرا۔

''اپنے ناپاک ہاتھوں کو دور رکھو۔'' اختر حسین منہ چھپاتے ہوئے بولے۔

''اوہ..... آپ تو ناراض ہو گئے..... میں نے یونہی مذاق کیا تھا..... اب میری طرف دیکھئے..... میں نے کتنی موٹی چادر لپیٹ رکھی ہے، دیکھئے، دیکھئے نا۔''

''او..... خبیث عورت اپنی غرض بتا۔''

''اختر صاحب..... آپ میں ذرا بھی حس نہیں مجھ جیسی نرم و نازک لڑکی کو خبیث کہتے ہیں..... اُٹھئے میری طرف تو دیکھئے۔''

اختر صاحب نے اپنا سر ہاتھوں سے نکالا، وہ واقعی ایک موٹی چادر اوڑھے کھڑی تھی۔ جس سے اس کا پورا جسم ڈھکا ہوا تھا۔ صرف چہرہ دکھائی دے رہا تھا، وہ مسکرائی۔

''بول۔'' اُن کی آنکھوں میں سرخی گھلنے لگی۔

urdunovelist.blogspot.com

''اُٹھ کر میرے پاس تو آیئے۔''

وہ تیزی سے اُٹھے۔ ''بول تیری غرض کیا ہے۔''

گل بانو مسکرائی۔ اپنے ہونٹوں کو سکیڑ کر دائرہ بنایا اور بڑے پیار بھرے انداز میں بولی۔ ''انہیں چوم لیجئے۔''

امام اختر حسین انصاری، سر سے پاؤں تک لرز گئے..... آنکھوں میں خون اُتر آیا، اُن کا ہاتھ خود بہ خود اُٹھا، ہوا میں لہرایا اور اتنی زور سے گل بانو کے گالوں پر پڑا کہ وہ اُلٹ گئی۔

گل بانو چوٹ کھا کر مسکرائی۔ اس کے گالوں پر خون کی پانچ لکیریں برابر برابر بہہ رہی تھیں۔

''اختر صاحب..... کل سے آپ کا کھانا بند، اس وقت تک کے لئے جب تک آپ میری یہ معمولی سی خواہش پوری نہ کر دیں گے۔''

''لعنت ہے تجھ پر اور تیری معمولی سی خواہش پر، دور ہو جا میری نظروں سے۔'' امام اختر حسین انصاری کڑکے۔

اور پھر واقعی اگلے دن سے نہ صرف اس نے کھانا پینا بند کر دیا بلکہ حقہ بھی بند کر دیا۔ دو دن اختر حسین صاحب نے بخیر و خوبی کاٹ دیئے۔ تیسرے دن سے ان کی حالت غیر ہونے لگی۔ کھانے کی بات ہو تو آدمی کسی حد تک برداشت کر لے لیکن پیاس کس طرح کوئی برداشت کرے اور پھر اوپر سے حقے کی طلب۔

جب ساتواں دن لگا تو اختر صاحب نے محسوس کیا کہ اب وہ زیادہ دن زندہ نہ رہ سکیں گے۔ پیٹ، پیٹھ سے جا لگا تھا، رنگ زرد ہو چکا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ ان کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ بھرا بھرا چہرہ سوکھ گیا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیوں کی تہہ جمی تھی۔

وہ بے جان سے مسہری پر پڑے تھے۔ ان سات دنوں میں گل بانو کئی بار اُن کے پاس آئی تھی۔ لیکن انہوں نے ہر بار اُس پر لعنت بھیج کر اسے مایوس لوٹا دیا تھا۔

وہ اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ اپنا ہاتھ پہلو سے اُٹھا کر سینے پر نہ رکھ سکتے تھے۔ آنتیں کھانے کے لئے فریاد کر رہی تھیں اور ہونٹ پانی کے لئے ترس رہے تھے۔

لیکن وہاں کھانا تھا، نہ پانی..... ہاں..... اُن کے سامنے گل بانو ضرور کھڑی تھی جو آہستہ آہستہ

سرہانے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اختر صاحب نے آہٹ سن کر بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ گل بانو مسکرا رہی تھی۔

اختر حسین اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پتا نہیں کس عالم میں۔

گل بانو آہستہ آہستہ اُن پر جھکنے لگی، اُس کے ہونٹ اُن کے پپڑی جمے ہونٹوں کے بالکل قریب آ گئے تو اختر صاحب نے اپنا ہاتھ اُٹھا کر اسے ہٹانے کی ناکام کوشش کی لیکن ہاتھ کو جنبش نہ ہو سکی۔

گل بانو مسکرائی۔ اور اس نے بڑے فاتحانہ انداز میں اپنے ہونٹوں کو پپڑی جمے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

اور تب ہی گرجدار قہقہہ فضا میں سنائی دیا، اس قہقہے کی آواز سے پورا محل لرز گیا، امام اختر حسین انصاری کے سامنے گل بانو کے بجائے ایک خبیث صورت شخص کھڑا تھا۔ گل بانو پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی تھی۔

''تم کون ہو؟'' اختر صاحب نے نحیف آواز میں کہا۔

''میں..... شیطان الشیاطین۔''

''کون ابلیس؟''

''ہاں..... میں ابلیس ہوں۔''

''لاحول ولاقوۃ۔''

''میرا تجربہ کامیاب ہوا۔'' ابلیس نے زور کا قہقہہ لگایا اور غائب ہو گیا۔ امام اختر حسین انصاری بے ہوشی میں ڈوب گئے۔

☆.....☆.....☆

علی گڑھ سے دس میل دور پورب کی طرف آج بھی یہ محل جوں کا توں کھڑا ہے جس میں شیطان نے اپنا تجربہ کیا تھا۔ اس کے اندر ہر چیز ویسے ہی رکھی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی ابھی اس محل کو چھوڑ کر گیا ہو۔ لوگ اسے ''شیطان محل'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کیا آپ علی گڑھ گئے ہیں۔

کیا آپ نے علی گڑھ میں شیطان محل دیکھا ہے؟ □□

urdunovelist.blogspot.com

بے نشاں منزلیں

اُسے پیدل چلتے ہوئے انتیس سال ہو گئے تھے۔ سر اور چہرے پر خاک جمی تھی۔ ڈاڑھی کے بال اُلجھے ہوئے اور بے ترتیب تھے جسم پر چند دھجیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ کمر کے گرد ایک لوہے کی زنجیر بندھی تھی جس سے اس کی کمر پر سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ ان انتیس سالوں میں اس کی جوانی گھل کر بڑھاپے میں تبدیل ہو گئی تھی، لیکن اس کے جنون میں رتی بھر فرق نہ آیا تھا۔ وہ بڑھتا ہی جاتا تھا، آگے اور آگے۔ اس کی منزل کہاں تھی؟ یہ اُسے معلوم نہ تھا۔ وہ کہاں سے چلا تھا؟ یہ یاد کرنے کی اسے ضرورت نہ تھی۔ بس وہ تھا اور لوہے کی زنجیر۔ آنکھیں راستے کے پتھروں پر لگی تھیں۔ وہ ایک پتھر اُٹھاتا، زنجیر پر رگڑتا اور پھینک دیتا۔ پھر دوسرا پتھر ہاتھ میں لیتا، زنجیر پر رگڑتا اور مایوسی سے پیچھے پھینک دیتا۔ وہ اب تک لاتعداد پتھر زنجیر پر رگڑ کر پھینک چکا تھا۔ لیکن گوہر مقصود اب تک ہاتھ نہ لگا تھا۔

وہ پارس پتھر کی تلاش میں گھر سے نکلا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ پارس کہاں سے ملے گا؟ بس اس کی مہم جُو طبیعت اور پارس حاصل کرنے کا جنون اسے گھر سے نکال لایا تھا۔

شہر سے نکلتے ہی سب سے پہلے اس نے ٹوٹی قبر کے بابا سے پارس پتھر کا پتہ دریافت کیا تھا۔ ٹوٹی قبر کا بابا، پارس پتھر کا نام سن کر بہت دیر تک ہنستا رہا، پھر وہ ہنستے ہنستے اچانک خاموش ہو گیا اور

بڑے گھمبیر لہجے میں بولا۔ ”پارس پتھر!..... پارس پتھر اُمید کے پہاڑوں پر ملے گا۔“

اور جب اس نے اُمید کے پہاڑوں کا پتہ دریافت کرنا چاہا، ٹوٹی قبر کے بابا نے اس سلسلے میں کچھ بتانے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ مایوس ہو کر آگے بڑھا۔

شام ڈھلے وہ ایک چھوٹی سی بستی میں داخل ہوا۔ وہاں اُسے ایک درخت کے نیچے سفید چادر اوڑھے ایک آدمی لیٹا دکھائی دیا۔ اس نے اس آدمی کے چہرے سے چادر ہٹائی، اسے ہلا کر جگایا اور اس سے پارس پتھر کا معلوم کیا۔

”پارس، آرزوؤں کے جنگل میں ملے گا۔“ یہ کہہ کر اس شخص نے سفید چادر اوڑھ لی۔ اب اس سے مزید سوال کرنے کی گنجائش نہ تھی۔

وہ اس شخص کو سوتا چھوڑ کر آگے چل دیا۔ رات اس چھوٹی سی بستی میں بسر کی۔ صبح ہوتے ہی وہ پھر پارس کی تلاش میں چل پڑا۔ چلتے چلتے اسے دریا کے کنارے ایک نیم برہنہ آدمی ملا۔ وہ دریا میں پاؤں لٹکائے بڑے انہماک سے بہتے ہوئے پانی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے حسب معمول اس آدمی کے سامنے اپنا سوال دُہرایا۔

سوال سن کر وہ چند لمحوں تک خاموش رہا، جیسے کسی طوفان کی آمد ہو۔ پھر اس نے جھک کر پانی میں ہاتھ ڈالا اور پانی سے لفظوں کے موتی نکالتے ہوئے بولا۔ ”پارس خواہشوں کے دریا میں ملے گا۔“

یہ کہہ کر اس نیم برہنہ آدمی نے دریا میں ڈبکی ماری اور خاصی دیر تک دریا سے نہ نکلا۔ مجبور ہو کر وہ دریا کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگا۔

جب وہ چلتے چلتے تھک گیا اور دھوپ میں خاصی تیزی آ گئی، تو اس نے ایک سایہ دار درخت کے نیچے کچھ دیر آرام کرنا مناسب سمجھا۔

درخت کے تنے سے پیٹھ لگا کر اس نے آرام سے پاؤں پھیلا دیئے اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔

ابھی اسے سوئے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ایک کمبل پوش آدمی نے اسے جھنجھوڑ کر اُٹھایا۔ اس نے حیرت سے کمبل پوش کو دیکھا۔ ایسی گرمی میں، اسے کمبل میں لپٹا دیکھ کر اسے کچھ زیادہ ہی گرمی محسوس ہونے لگی۔

urdunovelist.blogspot.com

''تجھے پارس پتھر کی تلاش ہے؟'' کمبل پوش آدمی نے پوچھا۔

''ہاں بابا!'' وہ اس انکشاف پر حیرت زدہ رہ گیا۔

''مورکھ تو خود پارس ہے۔ خود کو پہچان۔''

یہ سن کر اس نے کمبل پوش آدمی کی طرف سے منہ موڑ لیا اور تیزی سے اُٹھ کر چل دیا۔ اس آخری بات نے اسے اُلجھا کر رکھ دیا تھا۔ اب اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ کسی سے پارس پتھر کا معلوم نہیں کرے گا بلکہ خود ہی پارس کی تلاش میں دنیا کے اس کونے سے اس کونے تک چکر لگائے گا۔

یہ سوچ کر اس نے گائے کے گلے سے لوہے کی زنجیر کھول لی جو کھونٹے سمیت بھاگی جا رہی تھی۔ زنجیر کھول کر اس نے اپنی کمر سے باندھ لی اور راہ کے پتھروں کو غور سے دیکھتا ہوا چلنے لگا۔ جس پتھر پر اسے شبہ ہوتا کہ یہ پارس پتھر ہو سکتا ہے، اسے اُٹھاتا اور زنجیر پر رگڑ کر دیکھتا۔ زنجیر سونے کی نہ ہوتی تو مایوسی سے پھینک دیتا اور دوسرے پتھر کی تلاش میں آگے بڑھ جاتا۔

اب تک وہ جانے کتنے دریا، کتنے صحرا، کتنے جنگل پار کر چکا تھا۔ ہزاروں لاکھوں پتھر اس کے ہاتھ سے گزر چکے تھے۔ مگر اُن میں کوئی بھی پارس نہ تھا۔

سالہا سال کی جستجو کے بعد وہ ایک کوہستانی علاقے میں جا پہنچا۔ یہ پہاڑی سلسلہ سینکڑوں میل پر محیط تھا۔ یہاں چھوٹے بڑے کروڑہا پتھر موجود تھے۔ ان میں کوئی پارس بھی ہو سکتا تھا۔ لہٰذا کسی پتھر کو زنجیر سے مس کئے بنا چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔

اس نے ایک ایک پتھر کو زنجیر پر رگڑنا شروع کیا۔ اس کے ہاتھ بڑے مشینی انداز میں چل رہے تھے۔ وہ تیزی سے پتھر اُٹھاتا۔ زنجیر پر رگڑتا، دیکھتا اور پھر پتھر پیچھے کی طرف پھینک دیتا۔ یہ عمل برسوں جاری رہا۔

اور آج پارس پتھر کی تلاش میں اسے انتیس سال ہو گئے تھے۔ جوانی بڑھاپے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اب اس میں پہلا سا جوش باقی نہ رہا تھا۔ وہ بڑی بے دلی سے پتھر اُٹھاتا۔ بڑی بے زاری سے زنجیر پر رگڑتا اور بعض اوقات زنجیر پر نظر ڈالے بنا، پتھر پھینک دیتا۔ وہ بڑی حد تک مایوس ہو چکا تھا لیکن جس مقصد کے لئے اس نے پوری زندگی تباہ کر دی تھی، اسے حاصل کئے بغیر واپسی ممکن نہ تھی۔ وہ دل میں آشا کا دیپ جلائے آگے بڑھتا رہا۔

ایک شام جب سورج ڈوبنے لگا تو وہ ایک پہاڑی نالے میں پڑے، بڑے سے پتھر پر ستانے کے لئے بیٹھ گیا اور پاؤں پانی میں ڈال دیئے۔ نالے کے ٹھنڈے پانی نے اس کے دماغ تک ایک لطیف ٹھنڈک پہنچا دی۔ وہ ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر کے اس بڑے سے پتھر پر نیم دراز ہو گیا اور چاروں طرف نظریں گھمانے لگا۔ اندھیرا ہونے سے پہلے ہی رات گزارنے کے لئے کسی مناسب جگہ کا انتخاب کر لینا چاہتا تھا۔

اچانک اسے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک سفید ریش آدمی مسکراتا ہوا نظر آیا، اس کے ہاتھ میں پانی کا ایک بڑا سا ڈول تھا، غالباً وہ پانی بھرنے آیا تھا۔

''تم یہاں پتھر پر کیوں لیٹے ہو؟ آؤ میرے ساتھ چلو! میں وہاں رہتا ہوں۔'' اس بزرگ نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ''مجھے پچاس سال ہو گئے ہیں وہاں رہتے ہوئے۔ پاپی دنیا کو چھوڑ کر میں کتنے سکھ میں ہوں۔ شاید تم اس کا اندازہ نہ لگا سکو۔ پر تم کون ہو؟ پہلے یہ تو بتاؤ۔''

وہ پتھر پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے نورانی چہرے والے بزرگ کو گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ سر سے پاؤں تک سفید تھے۔ سر اور بھنوؤں کے بال بھی سفید تھے۔

''میں پارس کی تلاش میں آیا ہوں۔ آج مجھے گھر سے نکلے ہوئے پورے انتیس سال ہو گئے۔ میں گھر سے خالی ہاتھ چلا تھا۔ آج بھی خالی ہاتھ ہوں۔ شاید میری قسمت میں پارس نہیں۔'' اس نے بڑی مایوسی سے کہا۔

بزرگ نے یہ سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اس کی کمر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ذرا اپنی زنجیر کو تو دیکھو!''

اُس نے ڈرتے ڈرتے کمر سے بندھی زنجیر پر نگاہ ڈالی اور ہوش گم کر بیٹھا۔ پوری زنجیر سونے کی ہو چکی تھی اور وہ پارس پتھر جس کی تلاش میں اس نے پوری زندگی برباد کر لی، جانے کب اور کہاں اس کے ہاتھ سے پھسل کر پتھروں میں گم ہو گیا تھا۔

اس نے جنونی انداز میں زنجیر کمر سے کھول کر چشمے میں پھینک دی۔ اور بے نشاں منزلوں کی طرف دیکھ کر دُکھ سے رو دیا۔

□□

urdunovelist.blogspot.com

تسکین

اُس کے تین خط ممتاز کے سامنے کھلے پڑے تھے۔

یہ خط کچھ بدخط سے تھے۔ بدخط اس لحاظ سے کہ یہ خط تھے تو اگرچہ لڑکی کے لیکن تحریر لڑکیوں کی سی نہ تھی۔ موٹے نب سے لکھی یہ تحریر ترچھے ترچھے لفظ، لفظوں کے درمیان خالی جگہ، سطریں اوپر کی طرف اُٹھی ہوئیں اور کچھ اسی طرح کی چیزیں اس بات کی غماز تھیں کہ یہ لڑکی بڑی ''خوبیوں'' کی مالک ہے۔

اس کے چہرے پر آنکھ ناک کے مقابلے میں اس کے ہونٹ سب سے زیادہ خوبصورت تھے۔ موٹے نہ پتلے، ترشے ترشائے نرم اور بھرے بھرے سے۔ جب اس کے ہونٹ بند ہوتے تو یوں لگتا کہ ذرا سا دبائے جانے پر رس اب ٹپکا تب ٹپکا۔ وہ ان ہونٹوں کو دیکھ کر بے اختیار ہو جاتا۔ اُس کا جی چاہتا کہ اگر وہ کچھ اور نہیں کر سکتا تو کم از کم انگلیوں سے چھو کر ہی دیکھے۔

ویسے اُس کی آنکھیں بھی کم پرکشش نہ تھیں۔ لمبی، موٹی آنکھیں، شربتی شربتی سی۔ ان آنکھوں میں مہین سرخ ڈورے تیرتے تو آنکھوں میں بے پناہ مستی آجاتی۔ چہرے پر ریشمی بالوں کی لٹیں اِدھر اُدھر کلیلیں کرتی پھرتیں جب ہوا تیز ہوتی تو وہ اس کے ہونٹوں، گالوں اور آنکھوں سے لپٹ لپٹ جاتیں۔ وہ ایک خاص ادا سے اُنہیں ہٹاتی رہتی لیکن وہ باز نہ آتیں۔ اپنا کام کئے جاتیں۔

اس کی زلفیں اتنی سیاہ تھیں کہ وہ اکثر اسے چھیڑا کرتا تھا۔

''کیوں بھئی۔ یہ تم کلر کون سا استعمال کرتی ہو۔''

بظاہر وہ چڑ جاتی، غصہ دکھاتی، اندر ہی اندر اپنے سیاہ بالوں کی تعریف سے جن پر کسی اچھے کلر کا گمان ہوتا تھا اور جو سیاہ رات کی طرح کالے تھے، بڑی خوش ہوتی لیکن اُسے ہاتھ دکھا کر کہتی۔

''ہم ماریں گے۔ ہاں۔'' اُس کی اس ادا پر قربان ہونے کو جی چاہتا۔

وہ ناک میں چھوٹی سی چاندی کی نتھ پہنتی تھی جس سے اُس کا چہرہ مزید بھولا بھالا لگتا تھا۔

اور یہی بھولی بھالی صورت اُس کی دنیا اُجاڑ گئی۔

ہوا کا تیز جھونکا آیا اور ایک خط لرز کر زمین پر آرہا۔ اُس نے غصے سے کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر خط کو بیٹھے بیٹھے پاؤں کے انگوٹھے سے پکڑ کر اُٹھایا اور میز پر چھوڑ دیا۔

اس خط میں بڑے بڑے وعدے کئے گئے تھے۔ محبت کے وعدے، زندگی بھر ساتھ نبھانے کے وعدے، ساتھ چھوٹنے پر مر جانے کے وعدے۔ وہ خط کیا تھا، پیار کے لفظوں کا مجموعہ تھا۔ ایک ایسی چھوٹی سی لغت جس میں محبت بھرے لفظ بغیر معانی کے اکٹھا کر دیئے گئے تھے اور لغت کے پہلے صفحے پر لکھ دیا گیا تھا۔ ہر لفظ کے معانی ''پریت'' کے ہیں۔

وہ اکثر مر جانے کا ذکر کیا کرتی، کبھی زیادہ موڈ میں ہوتی تو ممتاز کو بھی اسی میں شامل کر لیتی۔ کہتی۔

''چلو..... ممتاز ہم دونوں مر جائیں۔''

''کس خوشی میں بھئی۔ میرا کیا قصور ہے۔'' وہ یہ کہہ کر ہمیشہ اُس کے رومانٹک موڈ کا ستیاناس کر دیتا۔

ممتاز کو ان ظاہرہ باتوں سے چڑ سی تھی۔ وہ کہتا تھا محبت زبان سے نہیں عمل سے ظاہر ہونی چاہئے۔

اور یہی وجہ تھی کہ اُس نے کبھی اپنی زبان سے محبت کا اظہار نہیں کیا تھا، ہاں یہ اور بات تھی کہ اُس کی آنکھوں نے ہزار ہا بار محبت کے راگ الاپے تھے۔

urdunovelist.blogspot.com

ایک دن ایسے ہی مرنے کی بات چلی تھی۔ وہ بار بار ممتاز کو اپنی محبت کا یقین دلا رہی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ ممتاز کے مقابلے میں وہ اُس سے کہیں زیادہ محبت کرتی ہے اور اُس کے لئے جان دے سکتی ہے جبکہ ممتاز ایسا نہیں کر سکتا۔

ممتاز ایسی باتیں بڑے حیرت کے انداز میں سنا کرتا تھا اور اُس کے ہر جملے کے جواب میں آنکھیں پھاڑ کر کہتا۔

''اچھا۔''

''ارے نہیں۔''

اور پھر بات مذاق میں ٹل گئی تھی لیکن دوسرے دن جب ممتاز اُس سے ملا تھا تو اُس کی جیب میں ریوالور تھا۔ اُس نے ریوالور جیب سے نکال کر میز پر رکھ دیا تھا اور کہا تھا۔

''یہ ریوالور ہے۔ اور بھرا ہوا ہے۔ اس بات کی تم تصدیق کر سکتی ہو۔ اب تم چاہو تو خود اپنے ہاتھ سے ریوالور کا استعمال کر دو یا مجھے حکم دو تو میں خود ہی اپنے آپ کو شوٹ کر لوں۔'' اور پھر اُس کا جواب سنے بغیر اُس نے ریوالور کنپٹی سے لگا لیا تھا۔

''نہیں۔'' وہ سہمے ہوئے انداز میں چیخی تھی۔ اُس بے چاری کی عجیب سی حالت ہو گئی تھی وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

''بس..... ڈر گئیں۔ تم بھلا کیا مرو گی تم تو دوسروں کو بھی مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتیں۔''

وہ یادوں کے سمندر میں کھڑا تھا۔ یادیں تھیں کہ سمندر کی لہروں کی طرح ایک کے بعد ایک آئے چلی جا رہی تھیں۔ اُسے لگا کہ وہ یادوں کے سمندر میں ڈوبا جا رہا ہے، ڈوبا جا رہا ہے۔

وہ بھی کوئی عجیب سا دن تھا۔ جب وہ دونوں آؤٹنگ کی غرض سے کسی شہر آئے تھے اور اب گھر واپس ہو رہے تھے۔ دونوں تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں خاموش سے بیٹھے تھے۔ گاڑی کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی تھی اور اُس نے یوں ہی کہہ دیا تھا۔

''آیئے..... یہاں اُتر جائیں۔''

اور ممتاز بغیر سوچے سمجھے اس ویران اسٹیشن پر اُتر گیا تھا۔ البتہ اُس کے ذہن میں یہ بات ضرور تھی کہ دو گھنٹے کے بعد گھر جانے کے لئے دوسری گاڑی مل جائے گی۔

پھر وہ اس اسٹیشن پر اُتر کر بڑے پچھتائے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی پورے اُٹھان پر تھی۔ پلیٹ فارم پر بیٹھنے کیلئے کوئی سایہ تک نہ تھا۔ چاروں طرف کچے مکانات اور آم کے باغات نظر آ رہے تھے۔ ممتاز نے اٹیچی بکنگ آفس میں رکھ کر ایک قریب کے باغ کی طرف رُخ کیا۔

''یار..... یہ تمہیں کیا سوجھی تھی۔'' ممتاز نے اُس کی چوٹی پکڑ کر کھینچی تھی۔

''اُف..... ارے چھوڑیئے چوٹی..... میں کیا کروں میں تو سمجھی تھی کوئی اچھا اسٹیشن ہو گا۔ یہاں تو کمبخت بیٹھنے کی جگہ تک نہیں۔ اور آپ نے اترنے کیلئے منع بھی نہیں کیا۔''

''بھئی سرکار کے حکم کے آگے میری کیا چلتی..... اس لئے تعمیل حکم ہی میں مصلحت جانی۔''

''واہ..... کیا کہنے ہیں آپ کے۔''

باغ میں آ کر دونوں نے ٹھنڈی سانسیں لیں۔ پھر ایک گھنا سا پیڑ منتخب کر کے اُس کے نیچے بیٹھ گئے۔ باغ کے کنارے گنے کا کھیت تھا۔ اور تھوڑے سے فاصلے پر ہی گاؤں کی آبادی تھی۔ وہ بولی۔

''ممتاز..... ہم گنا کھائیں گے۔''

''تو توڑ لائیے جا کر۔'' ممتاز نے ٹکا سا جواب دیا تھا۔

''ہم سے نہیں ٹوٹے گا۔''

''آپ سے نہیں ٹوٹے گا تو ہم سے بھی چوری نہیں ہو گی۔ کھیت والے نے دیکھ لیا تو دونوں کی مرمت ہو جائے گی۔''

''ارے جایئے بھی۔ گاؤں والے بہت فراخ دل ہوتے ہیں۔ وہ شہر والوں کی طرح کنجوس نہیں ہوتے۔''

اتنے میں ایک چھوٹی سی دیہاتی بچی کہیں سے آ نکلی۔ اُس نے اسے پکار کر گنا لانے کو کہا۔ اس لڑکی نے فوراً تین چار گنے توڑ کر اُس کے سامنے ڈال دیئے اور جانے لگی۔ ممتاز نے اُسے بلایا۔ اُس کے ہاتھ پر ایک اٹھنی رکھ دی۔ بچی بہت خوش خوش گاؤں کی طرف بھاگی۔

اُنہیں بیٹھے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ وہ سارے گنے کھا چکی تھی۔ باوجود اصرار کے ممتاز نے گنا نہ کھایا تھا۔ اُس کے ہونٹ گنے کے رس سے چپک رہے تھے۔ ممتاز پیڑ کے تنے سے پیٹھ

urdunovelist.blogspot.com

لگائے بیٹھا تھا۔ اور وہ اُس کی ران پر سر رکھے لیٹی تھی۔ ممتاز اُس کے ہونٹوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک خواہش شدت اختیار کر رہی تھی لیکن وہ نہ تو ایسا کر سکتا تھا اور نہ کرنا چاہتا تھا۔

دور سے ایک دیہاتی آتا ہوا نظر آیا۔ ہاتھ میں موٹی سی لاٹھی، سر پر پگڑ، میلی سے دھوتی اور اُس پر گاڑھے کا کرتہ۔ وہ انہی کی طرف آ رہا تھا۔ دونوں ہمت کر کے یوں ہی بیٹھے رہے اور وہ پگڑ والا ان کے قریب سے ہوتا ہوا کھیت میں گھس گیا۔ شاید وہ کھیت کا مالک تھا۔ پھر وہ کچھ دیر کے بعد وہاں سے نکلا اور اُن سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر بیڑی سلگانے لگا اور بیڑی سلگا کر وہیں بیٹھ گیا۔ ممتاز نے اُسے توجہ دیتے ہوئے بھی توجہ نہ دی اور وہ دونوں اطمینان سے یوں ہی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

پھر ایک جوان آدمی آیا۔ پھر کچھ بچے آئے، پھر دو اُدھیڑ عمر عورتیں آئیں، پھر ایک جوان لڑکی آئی، پھر تین بوڑھی عورتیں آئیں اور یہ سب ان سے کچھ دور دائرے کی شکل میں بیٹھتے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گرد خاصی بھیڑ لگ گئی۔ وہ تماشا بن کر رہ گئے۔ گاؤں والوں کے لئے یہ تماشا نیا تھا۔ ایک جوان لڑکی، ایک جوان لڑکا۔ بھری دوپہر، سنسان باغ، لیلیٰ مجنوں کی طرح بیٹھے ہوئے، تماشا نہ تھا تو اور کیا تھا۔

یہ بڑی اچھی بات تھی کہ گاؤں والے اُن سے کچھ نہ بولے۔ عورتیں اشارے کر کے چہ می گوئیاں کرتی رہیں۔ اور مرد بیڑی سوتتے رہے۔ وہ دونوں شرم سے گڑے جا رہے تھے، گاڑی کا وقت بھی ہو رہا تھا اور اُن میں اُٹھنے کی ہمت نہ تھی۔

ممتاز سوچ رہا تھا کہ اگر ایسے ہم کسی شہر میں ہوتے تو نہ جانے کیا ہو گیا ہوتا۔ کیسے کیسے آڑے ترچھے سوالات کئے جاتے۔ کیسی کیسی کھا جانے والی نظروں سے دیکھا جاتا اور کتنی بیہودگیاں کی جاتیں۔

ممتاز نے اس سحر کو توڑنے کیلئے بڑی جرأت سے کام لے کر ایک گاؤں والے سے گاڑی کا ٹائم پوچھا۔ اُس نے کہا۔ ''گاڑی کا وکت ہو گیا۔''

''اچھا''، دونوں دکھاوٹی گھبراہٹ کے ساتھ اُٹھے۔ لڑکھڑاتے قدموں سے اسٹیشن کی طرف دوڑے اور پھر وہ گاڑی میں بیٹھ کر اپنی اس بے وقوفی پر دیر تک ہنستے رہے تھے۔ بعد میں اُس نے

اس واقعہ کا ذکر بڑے مزے لے لے کر اپنے ایک خط میں کیا تھا جو اُس کے سامنے پڑا تھا۔

وہ دونوں شہر گھوم کر ابھی ابھی ہوٹل لوٹے تھے۔ بیرا میز پر کھانا لگا گیا تھا۔

ممتاز باتھ روم سے کپڑے بدل کر ہاتھ پونچھتا ہوا باہر نکلا تھا۔ وہ اس وقت کرتے پاجامے میں تھا۔ اُسے کرتے پاجامے میں دیکھ کر اُس نے کہا تھا۔

''اس لباس میں تو آپ بہت اچھے لگتے ہیں۔''

''اچھا۔''

''ہوں..... بس اب آ جایئے کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

''آپ ذرا یہ کرتے کی آستین پلٹ دیں۔ پھر شروع کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اُس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''لایئے۔'' پھر وہ بڑے چاؤ سے اُس کے کرتے کی آستین پلٹنے لگی تھی۔

اور پھر یہ ہوٹل کا کمرہ گھر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اُسے لگا کہ وہ اُس کی محبوبہ نہیں بلکہ بیوی ہے۔ وہ تھکا ہارا کام کر کے لوٹا ہے اور وہ میز پر کھانا سجائے اُس کی آمد کی منتظر ہے۔

''جانتی ہو..... تم اس وقت کیا لگ رہی ہو۔'' اُس نے کہا تھا۔

''کیا لگ رہی ہوں۔'' اُس نے بڑے پیار سے دیکھا تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح کچھ نہ کہہ سکا تھا۔

ہوٹل کے کمرے میں صرف ایک پلنگ ہی تھا کیونکہ سنگل روم ہی لیا گیا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور وہ ایک ہی پلنگ پر لیٹے تھے۔ ان کے درمیان کوئی دیوار نہ تھی۔ مگر تھی ایک دیوار ..... احساس کی۔

اُس کے دوستوں کا خیال تھا کہ ضرورت سے زیادہ شرافت ہی اُس کو لے ڈوبی تھی۔ اور وہ اُسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اگر کبوتری کے اُڑنے سے پہلے ہی اُس کے پر کاٹ دیئے جاتے تو پھر اُس میں پرواز کی سکت نہ رہتی۔

کاش کہ اُس نے ایسا ہی کیا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔

لوگ کہتے ہیں کہ یادیں کتنی حسین ہوتی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یادیں کتنی کربناک، اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں یادوں کے سہارے جیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے یادیں

urdunovelist.blogspot.com

آدمی کو موت کے قریب کر دیتی ہیں۔ جانے والا چلا جاتا ہے۔ اور کبھی نہیں آتا۔ لیکن اپنے پیچھے یادوں کا کارواں چھوڑ جاتا ہے۔ کاش کہ جانے والا ان یادوں کو بھی گٹھری میں باندھ کر اپنے ساتھ لیتا جاتا۔

☆.....☆.....☆

تم چلی گئیں۔ تم نے اچھا نہ کیا۔ جاتے وقت مجھ سے ملی بھی نہیں۔ مجھ سے کوئی شکایت بھی نہ کی۔ اگر تم کو جانا ہی تھا۔ مجھ سے نفرت ہی تھی تو پھر تم نے یہ ڈھونگ کیوں رچایا۔ کیوں مجھے پیار بھرے خط لکھے۔ کیوں اپنی محبت کا رہ رہ کر یقین دلایا۔ کیوں مرنے جینے کے ہزاروں لاکھوں وعدے کئے۔

اچھا تو یہ ہوتا کہ تم اپنے وجود کا ہر نقش میرے ذہن سے صاف کر جاتیں۔ یاد ماضی میرے لئے عذاب ہے کیونکہ تم مجھے ماضی ہی میں ملی تھیں۔

میرے دن، میری راتیں کیسے گزرتی ہیں۔ میں ہی جانتا ہوں۔ تم میرے اعصاب پر چھائی ہوئی ہو کہ تمہارے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ ذہن کھوکھلا ہو چکا ہے اور عمل کی قوت جواب دے چکی ہے۔ بس میں ہوں، تم ہو اور تمہاری یادیں ہیں۔

جب آنکھیں بند کرتا ہوں تو میرے ذہن میں لگا ہوا پروجیکٹر تمہاری یادوں کی فلم چڑھا دیتا ہے۔ پھر اعصاب میں ..... کھنچاؤ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ یادیں کبھی کبھی بڑی بھیانک صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

جب لیٹتا ہوں تو یادیں کھڑکیوں سے، دروازوں سے، روشن دانوں سے آ آ کر میرے گرد کھڑی ہو جاتی ہیں۔ یہ شیطان کی طرح مجھ پر ہنستی ہیں اور میرے بستر پر قبضہ کر لیتی ہیں۔ میں مجبوراً انہی یادوں کے بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔ اور یہ ہی یادیں چوبے بن کر میرے وجود کو لہولہان کر دیتی ہیں، میں ان سے چھٹکارے کیلئے تکیے پر سر پٹک پٹک دیتا ہوں اور یوں ہی صبح ہو جاتی ہے۔

تم مجھے بے وقوف بنا کر خوش ہوتی ہوگی۔ لیکن یہ اچھی طرح جان لو کہ تمہاری یہ خوشی عارضی ہے۔ تمہاری زندگی میں جب تک انگارے نہ بھر دیئے جائیں گے چین سے نہ بیٹھوں گا۔ تم بھی

روؤ گی، تڑپو گی، آہیں بھرو گی، فریاد کرو گی اور تمہاری فریاد سننے والا کوئی نہ ہوگا۔ تم نے کسی سے شادی رچالی۔ دُکھ اس بات کا ہے کہ تم نے مجھے دھوکے میں کیوں رکھا۔ میرا روپیہ ضائع اور وقت برباد کیا۔ آخر کیوں؟ ہمت تھی تو اسی شہر میں رہتیں۔ پھر میں تمہیں بتاتا، تمہیں دکھاتا کہ کسی کا دل دکھانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔

خیر گھبراؤ نہیں تم یہ شہر چھوڑ گئیں تو کیا ہوا۔ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں تو ملو گی۔ تمہارے یہ تین خط میں نے سنبھال کر رکھے ہیں۔ ان کا ایک ایک لفظ، تمہارے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ تحریر، گھر کا چراغ بن کر تمہارے ہی گھر کو جلا کر راکھ کر دے گی۔

☆.....☆.....☆

آخر تمہارا سراغ لگ ہی گیا۔ تم بمبئی میں ہو اور کسی وکیل کی بیوی بن کر رہ رہی ہو۔ اس عرصے میں تم نے ایک بچی کو بھی جنم دے دیا ہے۔ میں اس دوست کو اُٹھتے بیٹھتے دعائیں دیتا ہوں جس نے تمہارا تعاقب کر کے تمہارے بارے میں معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ تم کولابا روڈ پر ہیلیو پولس بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہتی ہو۔ تمہارا فلیٹ آخری فلور پر ہے اور تم تنہا رہتی ہو۔ بڑی پُرسکون زندگی بسر کر رہی ہو۔

دوسروں کا قرار لوٹنے والی خود سکون سے رہے ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں جب تم بے قرار ہو جاؤ گی۔ تمہارا سکون تم سے چھن جائے گا۔ تم بدچلنی کے الزام میں گھر سے نکال دی جاؤ گی۔ میں غصے سے کپکپا رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے اُڑ کر تم تک پہنچ جاؤں اور تمہیں تمہارے انجام تک پہنچا دوں۔ لیکن تم تک پہنچنے کیلئے دو دن درکار ہیں۔ آج صبح پانچ بجے کی گاڑی سے روانہ ہوں گا تو پرسوں تک پہنچ جاؤں گا۔

☆.....☆.....☆

تمہاری بلڈنگ کی لفٹ بھی آج ہی خراب ہونے کو رہ گئی تھی۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا اوپر پہنچا ہوں۔ میں بری طرح ہانپ رہا ہوں۔ تمہارے فلیٹ کے دروازے پر تمہارے شوہر کے نام کی تختی لگی ہے۔ دائیں ہاتھ کو کال بیل کا بٹن ہے۔ میں بٹن دبا کر ایک طرف ہو جاتا ہوں تاکہ تم دروازے میں لگی ''چھپی آنکھ'' سے دیکھ کر کہیں دروازہ کھولنے کا ارادہ ہی ترک کر دو۔ دروازے

urdunovelist.blogspot.com

کے پیچھے کسی کے دوڑ کر آنے کی آواز گونجتی ہے۔ پھر کچھ لمحے خاموشی رہتی ہے۔ شاید آنے والے نے ''چھپی آنکھ'' سے مجھے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور دروازے کے سامنے کسی کو نہ پا کر جلدی سے دروازہ کھول دیا ہے۔

تم میرے سامنے کھڑی ہو۔ پہلے سے خاصی تندرست ہوگئی ہو۔ بس یہی ایک تبدیلی تم میں ہوئی ہے۔ تم مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہو، جان کر انجان بننے کی کوشش کرتی ہو۔

''مجھے وکیل صاحب سے ملنا ہے۔'' میں کہتا ہوں تمہارے چہرے کا رنگ پھیکا پڑنے لگتا ہے۔ لیکن تم جلد ہی اپنے پر قابو پالیتی ہو اور بڑے اعتماد سے کہتی ہو۔ ''جی وہ کورٹ گئے ہیں۔''

''کب تک آئیں گے؟''

''اُن کا کچھ ٹھیک وقت نہیں، کبھی پانچ بجے آجاتے ہیں تو کبھی اس سے بھی پہلے اور کبھی رات گئے تک آتے ہیں۔''

''خیر کوئی بات نہیں۔ میں اُن کا انتظار کروں گا۔ جب تک آپ سے ہی کچھ باتیں ہوجائیں۔''

''جی۔'' لہجے میں حیرت اور خوف کے آثار ملتے ہیں۔

''جی۔'' میرا لہجہ طنزیہ ہوتا ہے۔

میں دروازے کی طرف بڑھتا ہوں اور تم کسی انجانے خوف سے متاثر ہو کر میرا راستہ چھوڑ دیتی ہو۔ میں بڑے اطمینان سے ٹہلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا ہوں اور ''گوڈریج'' کے آرام دہ صوفے پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اندر سے بچے کے رونے کی آواز آتی ہے۔ تم لپک کر اندر جاتی ہو، پھر ''بچ بچ'' کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اور کچھ دیر بعد ہی بچے کے رونے کی آواز بند ہوجاتی ہے۔ تم ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتی ہوئی پھر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی ہو۔ اب تمہارے چہرے پر جو تاثرات ہیں وہ تم سے چھپائے نہیں چھپ رہے ہیں۔ تم پریشان ہو رہی ہو۔ میری طرف خالی خالی خوفزدہ نگاہوں سے دیکھتی ہو۔

میں مسکراتا ہوں اور پھر آہستہ سے کہتا ہوں۔ ''مجھے پہچانتی ہو۔''

تم کوئی جواب نہیں دیتی ہو۔ تم کوئی جواب دے ہی کیا سکتی ہو۔ لیکن تمہاری بے چینی یہ ظاہر

کرتی ہے کہ تم جلد سے جلد میرے یہاں آنے کا مقصد جاننا چاہتی ہو۔ آخر تم سے صبر نہیں ہوتا۔ تم پوچھ ہی بیٹھتی ہو۔

''آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟''

''تمہارے اس سوال سے کم از کم یہ بات تو صاف ہوجاتی ہے کہ تم مجھے پہچانتی ہو۔ رہا تمہارے سوال کا جواب تو وکیل صاحب آجائیں وہ بھی بتادوں گا۔''

''اُن سے آپ کو کیا کام ہے۔''

''تمہیں کیوں بتاؤں۔''

''خدا کے لئے ممتاز کوئی ایسی بات نہ کرنا کہ میری زندگی تلخ ہوجائے۔''

''اور تم جو مجھے انگاروں پر لوٹتا چھوڑ کر آئی تھیں، اس کا خمیازہ کون بھگتے گا۔''

''میں نے تو کچھ نہیں کیا۔'' تم بھولی بن جاتی ہو۔

تمہاری اس بات پر مجھے غصہ آجاتا ہے۔ میں آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑتا ہوں۔ جانے کیا کیا آئیں بائیں شائیں بک جاتا ہوں۔ تمہیں جب بتاتا ہوں کہ میرے پاس تمہارے خطوط ہیں اور وہ خطوط تمہارے شوہر کو دکھانے لایا ہوں، تو تمہارے جسم میں کپکپی دوڑ جاتی ہے۔ تم اپنے کو لاکھ سنبھالنے کی کوشش کرتی ہو لیکن سنبھل نہیں پاتی ہو۔

''مجھے معاف کردو ممتاز ..... میری پُرسکون زندگی میں آگ نہ لگاؤ۔'' تمہاری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں۔

''محبت کی دنیا معافی کے لفظ سے ناآشنا ہے۔ یہ کسی کو نہیں بخشتی۔''

پھر گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ تمہارے چہرے کا رنگ بھیڑ کی اون کی طرح اُتر جاتا ہے۔ تم مجھے التجا بھری نظروں سے دیکھتی ہو۔ تمہاری یہ حالت دیکھ کر میرے جسم میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ میں ہونٹ بھینچ کر مسکراتا ہوں۔

گھنٹی پھر بجتی ہے۔ تم بڑی مشکل سے اُٹھتی ہو۔ دروازہ کھلتا ہے۔ تمہارا شوہر اندر داخل ہوتا ہے۔ میں ایک نظر تمہارے شوہر کو دیکھتا ہوں۔ وہ مجھے بہت سخت مزاج لگتا ہے۔

''مجھے عادل منصور کہتے ہیں۔'' وہ میری طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ میں ہاتھ ملاتا ہوں اور اپنا

urdunovelist.blogspot.com

نام بتاتا ہوں، وہ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے اور اندر چلا جاتا ہے۔ شاید لباس تبدیل کرنے۔ تم یرقان کے مریض کی طرح پیلی ہوگئی ہو۔ صوفے پر دھائیں سے گر پڑتی ہو اور سر جھکا کر بیٹھ جاتی ہو۔ شاید تم رو رہی ہو، ابھی کیا ہے؟ یہ تو رونے کی ابتدا ہے۔ اب تو تمہیں زندگی بھر رونا ہے، تڑپنا ہے، بالکل ایسے ہی جیسے میں رویا ہوں، تڑپا ہوں۔

تمہارا شوہر لباس تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا ہے۔ تم سسکتی ہوئی اندر چلی جاتی ہو۔ تمہارا شوہر پہلے تمہیں پھر مجھے حیرت سے دیکھتا ہے اور تمہارے پیچھے جانے لگتا ہے۔ میں اُسے روک لیتا ہوں، اپنے سامنے بٹھا لیتا ہوں اور پھر الف سے لے کر یے تک داستانِ غم دہرا دیتا ہوں اور ثبوت کے طور پر تمہارے خطوط اس کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔

وہ لوہے کی طرح تپ کر لال ہو جاتا ہے اور اندر کی طرف بھاگتا ہے۔ کچھ لمحے اندر خاموشی رہتی ہے۔ میں بے قرار ہو کر پہلو بدلتا ہوں۔ اندر سے ایک چیخ سنائی دیتی ہے۔

''نہیں۔ خدا کیلئے مجھے گولی نہ مارو۔ مجھے معاف کر دو عادل۔''

میں پردہ ہٹا کر اندر کی طرف جھانکتا ہوں۔ فائر ہوتا ہے، ایک حرکت قلب بند کر دینے والی چیخ اُبھرتی ہے۔ اور ساتھ ہی تمہارے جسم سے خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے۔ سارا فرش خون سے نہا جاتا ہے۔ میرا جی بے اختیار قہقہے لگانے کو چاہتا ہے۔ میں پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا ہوں اور پھر خون سے ہاتھ بھر لیتا ہوں۔

☆.....☆.....☆

صبح کے پانچ نہیں، چھ نہیں، پورے سات بج رہے ہیں۔ میں گھڑی کی طرف دیکھتا ہوں، گاڑی کا وقت کب کا نکل چکا ہے۔ پھر میری نظریں چھت میں لگی کڑیوں پر جم جاتی ہیں۔ ساری رات اسی طرح جاگتے گزری ہے۔ میں اس وقت اپنے کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔ ایک شعلہ جو ہر وقت میرے دل میں بھڑکتا رہتا تھا۔ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔

میں اُٹھتا ہوں۔ تکیے کے نیچے سے اُس کے خط نکالتا ہوں۔ دیا سلائی جلاتا ہوں اور پھر ایک ایک کر کے اُن خطوں کو جلانے لگتا ہوں۔ اور اپنے بندھے سامان کو کھولنے والی نظروں سے دیکھتا ہوں۔ □□

ٹوٹا ہوا آدمی

لیلیٰ نے پہلے میرے گلے میں بانہیں ڈالیں۔ پھر میٹھی سی آواز بنا کر میرے کان میں سرگوشی کی۔

''اب میں مسز صادق کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔''

یہ سن کر میں اندر ہی اندر سرد ہو گیا۔ لپٹی ہوئی لیلیٰ کا جسم مجھے انگارے کی طرح محسوس ہوا۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے سامنے کیا۔ پھر کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنے قریب کر کے اس کے پیٹ پر اپنا سر رکھ دیا۔

لیلیٰ نے فوراً میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔

میں چھپے چھپے بولا۔ ''کیوں؟''

''اب دیکھئے نا۔'' اس نے میرا چہرہ اوپر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ان کے ساتھ جانے سے فائدہ بھی کیا ہے۔ جو کچھ آتا ہے اس میں سے آدھے سے زیادہ تو وہ لے جاتی ہیں۔ میں نے اب طے کر لیا ہے کہ ان کے ساتھ ہرگز نہ جاؤں گی۔ میں کیوں نقصان اُٹھاؤں۔''

پھر اس نے میرے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔ ''ابھی آئی..... آپ کے لئے چائے بنا لاؤں۔''

''اب کیا ہوگا۔'' میرے اندر سے آواز آئی۔

urdunovelist.blogspot.com

میں نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا تو کمرے میں جگہ جگہ ہر طرف مکڑی کے جالوں کو لگا پایا۔ فرش مٹی سے اَٹا ہوا تھا۔ اور اس میز کرسی کے علاوہ جس پر میں بیٹھا تھا۔ مجھے کمرے میں کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں جھپکیں تو طلسم ٹوٹا۔ کمرے کی ہر چیز اپنی جگہ جوں کی توں رکھی تھی۔ ٹی وی، ریڈیو گرام، فریج، خوبصورت شوکیس میں رکھی ہوئی قیمتی چیزیں۔ ہر چیز اپنی جگہ۔ فرش پر بھاری قالین۔ کھڑکیوں پر موٹے پردے۔ دیواروں پر شاہکار تصویریں۔ سب ویسے کے ویسے، نہ کہیں دھول نہ کہیں مکڑی کے جالے۔

میں نے گول میز پر ٹانگیں پھیلا لیں اور اخبار اُٹھا کر یوں ہی دیکھنے لگا۔

اچانک ''ضرورت ہے'' کے کالم پر نظر پڑی۔ تو ذہن چرخی کی طرح چلنے لگا۔ میں اس چرخی سے نکلتی ہوئی یادوں کی ڈور کو کھینچتا گیا، کھینچتا گیا یہاں تک کہ چرخی خالی ہوگئی اور اس میں چھپا ہوا سرا میرے ہاتھ میں آ گیا۔

تعلیم سے فارغ ہوا تو ''ضرورت ہے'' درخواست اور دفتر، میری زندگی میں آندھی طوفان کی طرح داخل ہوگئے۔ زمانے کی دھول چاٹتا اور موجوں کے تھپیڑے کھاتا ہوا ایک دن کنارے جا لگا۔

میں نے گھر آ کر جب ماں کو بتایا کہ مجھے نوکری مل گئی ہے تو اُن کا چہرہ آئینے کی طرح ہنس پڑا۔ مجھے پیشانی پر پیار کیا۔

''بس بیٹے اب میں لیلیٰ کو گھر لے آؤں گی۔''

اور پھر وہ لیلیٰ کو گھر لے آئیں۔ اِدھر لیلیٰ سجی سجائی کار سے اُتری۔ اُدھر فرشتے میری ماں کو موت کی ڈولی میں بٹھا کر لے گئے۔ میں نہ ہنس سکا اور نہ رو سکا۔

تنخواہ معقول تھی۔ اس لئے شہر کے اچھے علاقے میں، میں نے گھر لے لیا۔ لیلیٰ نے گھر کا اتنی خوبصورتی سے ''میک اپ'' کیا کہ گھر بیاہی عورت کی طرح کھل اُٹھا۔ زندگی بڑے مزے سے گزرنے لگی۔

اِدھر فرم کا منیجر، مجھ پر بڑا مہربان تھا۔ جلد ہی ترقی کے امکانات تھے۔ میں اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ وقت پر آفس پہنچنا، دل لگا کر کام کرنا اور کوشش یہی ہوتی تھی کہ کام زیادہ سے زیادہ نکال دیا جائے۔

ایک دن میں اور لیلیٰ کوئی انگلش پکچر دیکھ کر نکل رہے تھے کہ میں سامنے سے آتی ہوئی ایک گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا۔ گاڑی میں میری فرم کا منیجر حبیب احمد تھا۔ اسے دیکھ کر میرا غصہ مصنوعی خوشی میں بدل گیا۔ میں گاڑی کی طرف لپکا۔ چہرے پر ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار سجائے۔

''ہیلو اشفاق کیا حال ہیں۔ پکچر دیکھ کر نکل رہے ہو، کیسی ہے پکچر۔'' منیجر نے گاڑی سے اُتر کر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کئی سوال کر ڈالے۔ یہ منیجر کی عادت تھی۔ وہ دوسروں کی سنتا کم تھا اور اپنی زیادہ کہتا۔

''جی پکچر ہمیں تو پسند آئی۔'' میں اس کے آخری سوال کا جواب دے پایا۔ اور چاہتا تھا کہ لیلیٰ کا تعارف کراؤں کہ منیجر نے اس کا موقع نہ دیا۔ لیلیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ مسز اشفاق ہیں ہیلو..... السلام علیکم۔''

''آداب عرض'' لیلیٰ نے ذرا گردن کو خم دے کر، پیشانی تک ہاتھ لے جا کر، ذرا سا مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیا۔ لیلیٰ کو یہ بتانے کی ضرورت نہ پڑی کہ یہ کون ہیں؟ وہ آپ ہی آپ سمجھ گئی کہ یہ حبیب احمد ہیں۔ میری فرم کا منیجر، جس کے ہاتھ میں ترقی کی ''باگیں'' ہیں۔

دو چار باتوں کے بعد لیلیٰ نے شام کی چائے پر منیجر کو مدعو کر ڈالا۔ اور یہ دعوت اس نے تھوڑے سے تکلف کے بعد قبول بھی کر لی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ دعوت منیجر نے قبول کیسے کر لی کیونکہ وہ اپنے ماتحتوں کے گھر آنے جانے کا سخت مخالف تھا۔

دوسرے دن وہ ٹھیک وقت پر گھر آ پہنچا۔ چائے کی میز پر کوئی خاص بات نہ ہو سکی۔ البتہ اتنا میں نے ضرور محسوس کیا کہ حبیب احمد، لیلیٰ سے بے تکلف ہونے کی کوششیں کر رہا ہے۔ لیکن لیلیٰ خلاف معمول کچھ دبی دبی سی رہی۔ صبح سے وہ سر میں درد بتا رہی تھی۔ ممکن ہے اسی وجہ سے اس کے چہرے کے کنول مرجھائے رہے۔

ہماری فرم کا کاروبار تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ کاروبار کو مزید وسعت دینے کے لئے شہر میں دو نئی برانچیں کھولی جا رہی تھیں۔ ان برانچ آفسوں میں برانچ منیجروں کا تقرر ہونا تھا۔ ہیڈ آفس نے میری پرسنل فائل مانگی تھی۔ اور مجھے اُمید تھی کہ اگر حبیب احمد نے میری فائل پر اچھے ریمارکس دے دیئے تو میرا بحیثیت منیجر تقرر ہو جانا یقینی ہے۔

urdunovelist.blogspot.com

میں آج کل حبیب احمد کے گرد چیل کی طرح منڈلا رہا تھا اور اس تلاش میں تھا کہ موقع ہاتھ آئے تو اسے خوش کر کے برانچ منیجری لے اڑوں۔

میں اسی دھن میں تھا کہ صاحب کا بلاوا آ پہنچا۔ میں دوڑا دوڑا منیجر کے کمرے میں گیا۔ منیجر نے مسکرا کر بیٹھنے کو کہا۔ میں سعادت مندی دکھاتے ہوئے تھوڑا سا جھجک کر بیٹھ گیا۔

''میرے پاس سینما کی تین ٹکٹیں ہیں۔'' منیجر نے عادت کے مطابق بغیر تمہید کے کہنا شروع کیا۔ ''اگر پکچر دیکھنے کا موڈ ہو تو مع بیگم پکچر ہال پر آ جائیں۔ چند گھنٹے مزے میں گزر جائیں گے۔ کام کے ساتھ آدمی کو تھوڑی تفریح بھی کرنی چاہئے۔''

''جی ہاں..... جی ہاں..... کیوں نہیں۔'' میں نے اوپر نیچے زور زور سے گردن ہلائی۔

فلم دیکھنے میں مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا بلکہ یہ تو ایک طرح کا اعزاز تھا اور میری پرسنل فائل پر اچھے ریمارکس ملنے کی پہلی سیڑھی۔

لیلیٰ نے آج اپنے آپ کو خوب سجایا بنایا تھا اور وہ ضرورت سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔ چلنے سے پہلے جب میں نے اسے بانہوں میں لے کر شوہر کا پیار دینا چاہا تو اس نے میری ناک پکڑ کر ہنستے ہوئے کہا۔

''بس بس، میک اپ خراب کرنے کی کوشش نہ کریں۔ چلئے دیر ہو رہی ہے۔''

پکچر ہال پر منیجر ہمارا منتظر تھا۔ ہم ایک باکس میں جا بیٹھے۔ باکس تین سیٹوں کا تھا۔ لیلیٰ نے کنارے والی سیٹ پر بیٹھنا چاہا لیکن میں نے اسے آگے دھکیل کر درمیان میں بٹھا دیا۔ اس کا ایک کنارے پر بیٹھنا کرٹسی کے خلاف تھا۔

مجھے سگریٹ کی سخت طلب ہو رہی تھی۔ انٹرول میں بھی میں سگریٹ نہ پی سکا تھا۔ کیونکہ سارا وقت چائے اور کھلانے پلانے کی نذر ہو گیا۔ فلم میں ابھی تقریباً ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پکچر بھی کچھ بور سی تھی۔ میں ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا اور حبیب احمد سے پانچ منٹ کی اجازت لے کر باکس سے باہر آ گیا۔ اتنی دیر کے بعد سگریٹ پی تھی، پہلے کش میں عجیب فرحت کا احساس ہوا۔

دروازے کے قریب سگریٹ پھینکا۔ ایک ہاتھ سے دروازے کا ہینڈل پکڑا اور جوتے سے سگریٹ کو رگڑ کر جیسے ہی دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ منیجر لیلیٰ پر جھکا ہوا ہے اور لیلیٰ اس سے

چھٹکارے کے لئے کسمسا رہی ہے۔

میرے جسم میں انگارے سے بھر گئے۔ منیجر مجھے دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لیلیٰ ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے کونے میں دبک گئی۔ میں نے لیلیٰ کا ہاتھ پکڑا، وہ اسپرنگ کی طرح اُچھل کر کھڑی ہو گئی۔ میں گھسیٹتا ہوا اسے باہر لے آیا۔ اور دوسرے روز فرم کے نام اپنا استعفیٰ روانہ کر دیا۔

لیکن استعفیٰ منظور نہیں ہوا..... فرم نے مجھے غبن کے کیس میں ملوث کر کے میرے وارنٹ گرفتاری نکلوا دیئے۔ میں گرفتار ہوا۔ مسٹر صادق نے میری ضمانت لی اور یہاں سے قسمت کی مکڑی نے مجھے انتہائی مہین دھاگے میں جکڑنا شروع کر دیا۔

ایک سال تک مقدمہ چلا۔ اور اس دوران کتنے ہی دن ایسے گزرے جس میں میری اور لیلیٰ کی زبانیں ایک ایک نوالے کے لئے ترس گئیں۔ مقدمے کے فیصلے تک دوسری سروس ملنا نہ صرف مشکل بات تھی بلکہ ناممکن..... ادھر مقدمہ لڑنا تھا اور سچ کو سچ ثابت کرنے کیلئے پیسے کی اشد ضرورت تھی۔

پیسہ.....؟

پھر کیا ہوا..... کیسے ہوا..... مجھے نہیں معلوم۔

میرے گھر میں بھی مسٹر صادق کی طرح پیسہ آنے لگا۔ بس اتنا ہوتا کہ لیلیٰ مسز صادق کے ساتھ پکچر دیکھنے چلی جاتی..... اور میں چاہتے ہوئے اسے نہ روک سکتا۔ میری حالت صحرا میں بھٹکے ہوئے اس مسافر کی سی تھی جو بھوک اور پیاس کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ اچانک کسی نے اسے سور کا گوشت دیا۔ اس نے لاچار کھا لیا۔ پھر اسے مسلسل ایسا ہی گوشت بغیر کسی محنت کے ملنے لگا تو آہستہ آہستہ وہ اسی کا عادی ہو گیا۔

کبھی ضمیر نے سر اُٹھانے کی کوشش کی تو اسے جھڑک دیا۔

فرم، مجھ پر غبن کا الزام ثابت نہ کر سکی۔ عدالت نے مجھے باعزت بری کر دیا۔

لیکن اس مقدمے کی وجہ سے میں جن برائیوں کی دلدل میں پھنس چکا تھا۔ اس سے نہ نکل سکا۔ یا میں نکلنا نہیں چاہتا تھا۔

urdunovelist.blogspot.com

اسی لئے لیلیٰ کے یہ کہنے پر کہ اب وہ مسز صادق کے ساتھ نہیں جائے گی۔ میں اندر ہی اندر سن ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا ہوگا..... اتنے میں لیلیٰ چائے بنا کر لے آئی..... پیالی میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

''لو چائے پی لو..... پھر جلدی سے کپڑے پہن کر تیار ہو جاؤ۔ آج تم میرے ساتھ پکچر دیکھنے چلو گے۔''

''میں'' میں کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔ لیلیٰ کے لہجے میں اگرچہ حکم نہ تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے ایسا لگا کہ اگر میں نے جانے سے انکار کیا تو لیلیٰ سوتے میں میرا گلا دبا دے گی۔ میرا ہاتھ بے اختیار گلے پر چلا گیا۔ لیلیٰ چائے رکھ کر جا چکی تھی۔ اس نے اپنی بات کا ردعمل جاننے کی بھی کوشش نہ کی۔

میں نے تیز گرم چائے ٹھنڈی سمجھ کر پی اور جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگا۔

فلم کے ٹکٹ لے کر ہم دونوں باکس میں جا بیٹھے۔ تیسری سیٹ ابھی تک خالی تھی۔ لیلیٰ بڑی بے چین سی تھی۔ وہ بار بار پیچھے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی، لیکن آنے والا ابھی تک نہیں آیا تھا۔

عجیب تذبذب کا عالم تھا۔

میں بور سا ہو کر اُٹھا اور سگریٹ پینے کے لئے باہر چلا آیا۔ ابھی سگریٹ کے دو چار کش ہی لے پایا تھا کہ میں نے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو جس کی انگلیوں میں کار کی چابی کھیل رہی تھی۔ اپنے باکس میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے جلدی سے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔ اور جلدی جلدی سگریٹ کے کش لینے لگا۔

جب میں ہال میں داخل ہوا تو نیوز ریل شروع ہو چکی تھی۔ میں درمیان کی سیٹ پر بیٹھنے لگا۔ تو لیلیٰ نے یہ کہہ کر آپ میری سیٹ پر آ جائیے۔ مجھے یہاں سے صاف نہیں دکھائی دے رہا۔ اور خود درمیان کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ مجھے کنارے کی سیٹ پر بٹھا دیا۔ میں نے احتجاج کرنے کی بجائے خوشی سے کنارے کی سیٹ قبول کر لی۔

انٹرول میں، میں جب باہر آنے کے لئے اُٹھا تو لیلیٰ نے میرا ہاتھ آہستہ سے دبا کر کہا۔

''اطمینان سے آنا۔''

جواباً میں نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔

انٹرول ختم ہو جانے کے بعد بھی میں بے مقصد اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ جب میں گھومتے گھومتے تھک گیا تو باکس کی طرف بڑھا۔

باکس کا جیسے ہی دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ لیلیٰ کی بانہیں ادھیڑ عمر آدمی کے گلے میں ہیں۔ اور ہونٹ ایک دوسرے سے پیوست۔

میرا جسم اچانک سرد ہونے لگا۔ اور میں تھکا تھکا سا چلتا ہوا اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

وہ دونوں سنبھل چکے تھے۔ لیکن میں نے تو کچھ نہیں دیکھا تھا۔

پکچر ختم ہونے کے بعد باکس سے باہر نکلنے لگے تو ادھیڑ عمر آدمی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے لیلیٰ سے پوچھا۔ ''یہ کون ہیں؟''

''جی..... یہ میرے بھائی ہیں۔'' لیلیٰ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میرے ذہن میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔

اس شخص نے اپنی جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''آپ صبح اس پتے سے انہیں لے جائیں۔''

کارڈ میرے ہاتھ میں تھا اور اس کا بازو لیلیٰ کی کمر میں۔

لیلیٰ چلی گئی..... لیلیٰ نے جاتے ہوئے مجھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

کہیں سے آواز آ رہی تھی۔

''جی..... یہ میرے بھائی ہیں..... میرے بھائی..... میرے بھائی..... اس پتے سے انہیں لے جائیں..... اس پتے سے۔''

میں تقریباً بھاگتا ہوا پکچر ہال سے نکلا۔ اور گھر جا کر بیڈ پر گر پڑا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں ٹوٹ کر بکھر گیا ہوں۔ □□

urdunovelist.blogspot.com

پاگل اور یادیں

رات سیاہ ہاتھی کی طرح جھوم رہی تھی۔

آسمان پر گہرے سیاہ رنگ کی چادر بچھی تھی۔ اس بھیگی چادر سے جس میں لاتعداد چھید تھے، پانی رس کر زمین پر گر رہا تھا۔

رم جھم رم جھم بوندیں برس رہی تھیں۔

گلی میں کوئی آواز نہ تھی۔ جی نہیں، میں نے غلط کہا۔ گلی میں آواز تھی، پرنالوں سے گرتے ہوئے پانی کی۔ بہت آہستہ جیسے کوئی دو فٹ کے فاصلے سے کٹورے میں پانی ڈالے۔

میں برآمدے میں لیٹا ہوں، برابر میں میری بیوی کا پلنگ ہے۔ وہ میرے اور اپنے بچے کو لٹائے سو رہی ہے۔ میں جاگ رہا ہوں، بلب روشن ہے۔ رات زیادہ نہیں بیتی۔ مشکل سے گیارہ بجے ہوں گے۔

میں کروٹ لے کر صحن میں گرتی ہوئی بوندوں کو دیکھنے لگتا ہوں۔ اُن سے پیدا ہونے والا آہنگ سننے لگتا ہوں۔ سوچتا ہوں شاید اس طرح نیند آجائے۔ لیکن نیند نہیں آتی۔ میں کروٹ بدل کر اپنی بیوی کو دیکھتا ہوں۔ میری ان پڑھ اور دیہاتی بیوی ہاتھ کے اوپر سر رکھے سو رہی ہے۔ میرا اور اس کا بچہ اس کے سینے پر اپنے ننھے منے ہاتھ رکھے بڑے مزے کی نیند لے رہا ہے، میں

سوچتا ہوں، اپنی دیہاتی اور ان پڑھ بیوی کو کیوں پریشان کروں۔ دن بھر کی تھکی ہاری ہے، بہت کام کرتی ہے بے چاری۔ بڑی خدمت گزار ہے۔ میں اس کی طرف سے کروٹ بدل لیتا ہوں اور پھر ایک بار سونے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے نیند کیوں نہیں آرہی ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا۔ شاید آج میں نے چائے زیادہ پی لی ہے، میں چائے بھی تو بہت پیتا ہوں۔ ہر آدھے گھنٹے کے بعد ایک پیالی، پھر نیند کہاں سے آئے۔

بارش کچھ تیز ہوگئی ہے۔ آسمان پر کبھی کبھی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ گلی میں پرنالے گرنے کی آواز میں اضافہ ہوگیا ہے۔ میرے صحن میں موتی گر رہے ہیں۔ بڑے نازک موتی، جو گرتے ہی کرچی کرچی ہوجاتے ہیں۔

یہ کس کی آواز ہے.....؟ جی ہاں..... یہ کسی کی آواز ہے..... یہ کون گا رہا ہے؟ آواز کتنی پُر درد ہے۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی وعدہ یعنی نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

شاید یہ وہی پاگل ہے جو کئی روز سے اس محلے میں آیا ہوا ہے۔ پتہ نہیں کون ہے، کہاں سے آیا ہے، لوگ کہتے ہیں (میں نے تو اُسے ابھی تک دیکھا نہیں) وہ گم صم سا رہتا ہے۔ اس کی آنکھیں کسی نہ دکھائی دینے والی چیز کو دیکھتی رہتی ہیں۔ وہ کسی سے ایک لفظ بھی نہیں بولتا۔ جیسے کسی نے کہہ دیا ہو اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو پھانسی دے دی جائے گی۔ وہ صرف گاتا ہے اور یہی غزل گاتا ہے۔

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی، کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

آواز فضاؤں کو گھائل کرتی میرے دل میں پیوست ہوئی جارہی ہے۔

وہ نئے گلے وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

میرا دل کانپ رہا ہے۔ ذہن جھنجھنا رہا ہے۔ یہ کیسی آواز ہے جو میرے پورے وجود کو سرد کیے

urdunovelist.blogspot.com

دے رہی ہے۔

کبھی سب میں بیٹھے جو روبرو، تو اشارتوں ہی میں گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

فلک کی پیشانی بار بار چمکتی ہے، بادل شور کر رہے ہیں۔ بارش بڑھ رہی ہے۔ گلی میں پرنالے چیخ رہے ہیں اور میں خاموشی سے اپنے دل کو مٹھی میں بھینچے سن رہا ہوں۔

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر، وہ کرم کہ تھا میرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ بڑی پُرسوز آواز ہے۔ روح کی گہرائیوں سے نکلتی ہوئی آواز۔ میں اب زیادہ نہیں سن سکتا، زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر ہی کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ کس نے اس کو درد دیا، کون تھا جو اسے بھول گیا۔

جسے آپ گنتے تھے آشنا، جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

فضا میں یہ ٹھہراؤ سا کیوں ہے۔ شاید فضا بھی اس کی آواز سے متاثر ہوئی ہے۔ رندھے گلے سے نکلتی ہوئی آہ اب بند ہو چکی ہے..... متاثر کرنے والے شعروں کی غزل اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔

بارش اب موسلا دھار ہو رہی ہے۔ تیز ہوا ہے۔ بوندیں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ میری چارپائی تک آنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میں اپنی بیوی کی طرف کروٹ لے لیتا ہوں۔ میری آنکھیں بند ہیں۔ مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔

اس دن بھی بارش ہو رہی تھی۔ میں بھیگتا ہوا اسٹیشن پہنچا تھا۔ یہ ذکر تقریباً دو سال پہلے کا ہے۔ پلیٹ فارم پر پہنچتے ہی میں نے رین کوٹ اتارا اور اسے جھٹک کر، تہہ کر کے ہاتھ پر ڈال لیا۔ انکوائری سے گاڑی جانے کا وقت پوچھا۔ گاڑی ٹھیک وقت پر جا رہی تھی۔ میں تیز تیز قدم رکھتا ہوا

پلیٹ فارم نمبر ایک پر پہنچا۔

شہناز نے مجھے دُور سے ہی آتے ہوئے دیکھ لیا۔ اپنا رومال ہلا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ سیکنڈ کلاس لیڈیز کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑی تھی۔ بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کی زلفیں حسبِ معمول اس کے چہرے سے کھیل رہی تھیں۔

قریب پہنچا تو اس نے اپنی پیشانی پر دو انگلیاں رکھ کر آداب کیا۔ میں نے جواب دینے کی بجائے اس سے پوچھا۔ ''کتنی دیر ہوئی تمہیں آئے ہوئے؟''

''بس ابھی ابھی آئی ہوں، مشکل سے پانچ منٹ گزرے ہوں گے۔ سامان رکھوا کر آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی۔''

''میں سوچ رہا تھا کہ کہیں تم بور نہ ہو گئی ہو۔''

وہ ڈبے سے نیچے اُتر آئی۔ تب ہی گاڑی میں انجن لگ گیا۔ شہناز بریلی جا رہی تھی۔ بریلی گاڑی، علیگڑھ سے بن کر چلتی ہے۔ انجن لگنے کا مطلب تھا کہ گاڑی دس پندرہ منٹ میں روانہ ہونے والی ہے۔ گاڑی چلتے ہی شہناز میری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گی اور میں تنہا اس پلیٹ فارم پر کھڑا رہ جاؤں گا۔ اس خیال کے آتے ہی میں کچھ پریشان سا ہو گیا اور اپنی پریشانی کو آنکھوں کے ذریعے اس کے خوبصورت چہرے میں سمو دینا چاہا۔

''ایسے مت دیکھئے۔'' وہ بولی۔

''اب خدا جانے کب ملاقات ہو!'' میں پریشان تھا۔

''ہم جلد ہی ملیں گے۔'' اس نے بڑے یقین سے کہا۔

''کیا تمہیں سب وعدے یاد ہیں؟''

''مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا۔'' اس نے بڑے پیار سے کہا۔ ''میں جاتے ہی ابو سے بات کر لوں گی۔''

''اور اگر انہوں نے انکار کر دیا تھا؟''

''تو پھر بغاوت کرنا ہو گی۔''

سگنل ہو گیا، دو تین منٹ کے بعد گاڑی چلی جائے گی اور شہناز بھی چلی جائے گی۔ میں نے

urdunovelist.blogspot.com

گھبرا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا، حالانکہ میں جانتا تھا، یہ علی گڑھ ہے۔ یہ علی گڑھ کا اسٹیشن ہے۔ یہاں اس طرح ہاتھ پکڑنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ آدمی جب جوش میں ہو تو روایتیں ٹوٹ ہی جاتی ہیں۔

شہناز نے کچھ لمحوں بعد اپنا ہاتھ آہستہ سے کھینچ لیا اور میری طرف اُداسی سے دیکھا، اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

گارڈ نے سیٹی دی اور ہری جھنڈی دکھائی۔ چند لمحوں بعد گاڑی حرکت میں آ گئی۔

میں گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی اور کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔ میں بھی خاموش تھا۔ شاید بات نظروں میں ہو رہی تھی۔

گاڑی تیز ہو رہی تھی۔ شہناز بولی۔ ''بس اب رک جایئے۔''

میں رک گیا۔ اس نے اپنی پیشانی پر دو انگلیاں رکھ کر خدا حافظ کہا اور منہ پھیر لیا۔ شاید اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

میں نے جیب سے رومال نکال کر ہوا میں ہلانا شروع کیا۔ جواب میں وہ بھی رومال ہلانے لگی۔ اس کا رومال سرخ تھا اور میرا سفید۔ میں جانے کب تک رومال ہلاتا رہتا اگر کوئی میرے کان میں یہ نہ کہتا۔ ''بھائی صاحب گاڑی چلی گئی۔''

ہاں، گاڑی واقعی جا چکی تھی، بہت دور، میں نے اپنی آنکھوں پر سفید رومال رکھ لیا۔ زندگی میں پہلی بار میری آنکھیں کسی لڑکی کے لئے روئی تھیں۔

بارش تھم چکی تھی۔ آسمان پر سرمئی بادلوں کے اُڑن کھٹولے اُڑ رہے تھے۔ میں رکشا پر سوار ہو کر گھر کی طرف چلا۔ رکشہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا، لیکن میرے تخیل کی پرواز بہت بلند تھی۔

مجھے اردو ادب سے دلچسپی تھی۔ (اب بھی ہے) اس لئے بی اے کے بعد میں نے ایم اے اردو میں داخلہ لے لیا۔ کلاسیں شروع ہو گئیں۔ پہلے دن جب میں نے شہناز کو دیکھا تو متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

میں نے اپنے دوست نذیر سے کہا۔ ''اس کا نام معلوم کرو۔''

نذیر نے میری طرف شرارت سے دیکھا اور بولا۔ ''بیٹا ہو گئے ابھی سے عاشق۔''

''یار اس میں عاشق ہونے کی کیا بات ہے مجھے یہ لڑکی پسند ہے بس۔''

''بس؟''

''بس!''

اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

نذیر نے جلد ہی نہ صرف اس کا نام معلوم کر لیا بلکہ اس کے متعلق چند اور معلومات بھی حاصل کر لیں۔

''یہ لڑکی بریلی کی ہے۔ اس کے فادر پولیس انسپکٹر ہیں۔ اس کا نام شہناز ارشد ہے۔ بیٹا ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا، کہیں تھانے میں نظر آؤ۔''

شعبہ اردو کی ادبی انجمن کی طرف سے کرشن چندر کے اعزاز میں ایک جلسہ ہوا..... جس میں انہوں نے ایک افسانہ سنایا اور افسانے کے فن پر ایک مختصر سی تقریر بھی کی۔

جلسے کے بعد چائے کا پروگرام تھا۔ میں جس میز پر بیٹھا تھا۔ وہاں نذیر کے علاوہ شہناز اور اس کی دو سہیلیاں بھی موجود تھیں۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ ہمارے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔

شہناز نے چائے بنانے کا کام سنبھالا۔ مجھ سے شکر کے لئے پوچھا۔ ''آپ کو کتنی شکر دوں؟''

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی کم بخت نذیر بول پڑا۔ ''یہ بغیر دودھ اور بغیر شکر کی چائے پیتے ہیں۔''

''ابرار صاحب واقعی؟''

شہناز نے پہلی بار، اپنی زبان سے میرا نام لیا تھا۔ اپنا نام اس کی زبان سے سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں کہنے ہی جا رہا تھا کہ نذیر مذاق کر رہا ہے کہ نذیر نے میرا پاؤں دبا دیا۔

چائے کا جب پہلا گھونٹ لیا تو مجھے عجیب سا لگا۔ میں نے منہ بنایا۔ اس نے میرے منہ کو دیکھا اور اصل معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی۔

''دوستوں کا کہنا ماننے کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی اپنی خواہش کو ملیا میٹ کر دے..... بولئے آپ کو کتنی شکر دوں؟'' اس نے شکر دانی میں چمچہ ڈالا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہاں کسی قسم کا کوئی جذبہ نہ تھا۔

urdunovelist.blogspot.com

''جی شکر کی ضرورت نہیں۔ بس آپ میری پیالی کو اپنے ہونٹوں سے مس کر دیجئے۔'' میرے ہونٹ پھڑ پھڑائے۔

یہ سن کر اس کے ہونٹ لرزے۔ مجھے تیز نظروں سے دیکھا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ شکر دانی میز پر زور سے پٹکی اور بس۔

مجھے ایک دم احساس ہوا کہ یہ جملہ خاصا شوخ تھا، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ گولی بندوق سے نکل چکی تھی۔

وہ مجھ سے کئی دن تک ناراض رہی۔ بات تک نہ کی۔ میں نے بھی خاموشی اختیار کی یا یوں کہئے کہ بات کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

دن گزرتے گئے۔ وہ زیادہ دن مجھ سے ناراض نہ رہ سکی۔ روز بروز میرے قریب آتی گئی یا میں اس کے قریب ہوتا گیا۔

ایک دن لائبریری سے اس کو کسی کتاب کی ضرورت تھی۔ شاید وہ راجندر سنگھ بیدی کی ''ایک چادر میلی سی'' تھی۔ میں نے یہ ناول اسے لائبریری سے لا کر دے دیا اور ناول کے پہلے صفحے پر یہ جملہ لکھ دیا۔

''اگر کسی لڑکی سے محبت ہو جائے تو اسے بتا دینا چاہئے، ورنہ اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔''
ماکسم گورکی ''ماں''

تیسرے دن اس نے کتاب واپس کر دی۔ وہ کچھ شرمائی شرمائی سی تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے جھپٹ کر کتاب کھولی۔ میرے جملے کے نیچے لکھا تھا۔

''ماکسم گورکی ٹھیک کہتا ہے۔''

میں نے ''ایک چادر میلی سی'' کو بے اختیار گلے لگا لیا۔

میرا رکشہ پل سے نیچے اُتر رہا تھا۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ اس لئے میں نے اپنی یادوں کا سوئچ آف کر دیا اور رکشا کی تیز رفتاری کا لطف اُٹھانے لگا۔

دن بڑی بے چینی سے گزر رہے تھے۔ ڈاکیئے کا انتظار کبھی کبھی محبوبہ کے انتظار سے بھی زیادہ جان لیوا ہو جاتا لیکن شہناز کا خط نہ آ پاتا۔ انتظار ہی انتظار میں تین ماہ گزر گئے تھے۔ اب معاملہ

برداشت سے باہر تھا۔ میں سوچ سوچ کر سوکھا جا رہا تھا۔ آخر کیا ہوا؟ کہیں اس کے ابو نے انکار تو نہیں کر دیا۔ کہیں وہ جذبات میں آ کر کچھ نہ کر بیٹھی ہو۔

میں اس کے دیئے ہوئے پتہ پر اس کے شہر بریلی پہنچا، پھر اس کے محلے، اس کے کوچے اور گھر کو تلاش کیا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک عمر رسیدہ آدمی باہر نکلا۔ وہ کسی بھی طرح پولیس انسپکٹر نظر نہ آتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''مجھے ارشد علی صاحب سے ملنا ہے۔''

''وہ تو دو مہینے ہوئے یہاں سے چلے گئے۔ ان کا کہیں تبادلہ ہو گیا۔''

☆.....☆.....☆

میں دن بدن کمزور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ امی مجھے دیکھ دیکھ کر روتی تھیں۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ اس کی شادی کر دو۔ اس مشورے پر فوراً عمل کیا گیا اور میں ایک دیہاتی لڑکی سے بیاہ دیا گیا۔

ایک سال بیت گیا۔ میں تندرست ہونے لگا۔ وہ زہر جو میرے جسم میں پھیل گیا تھا۔ اُترنے لگا۔

میں کاروبار کے سلسلے میں لکھنؤ سے واپس آ رہا تھا۔ ڈبے میں جیسے ہی گھسا، میرا دم گھٹنے لگا۔ گاڑی چل چکی تھی ورنہ میں فوراً ڈبہ بدل لیتا۔

سامنے شہناز بیٹھی تھی، بالکل وہی۔ ذرا بھی تو نہ بدلی تھی۔ میں بیٹھ گیا۔ اس نے پلکیں اُٹھا کر بے اختیار مجھے دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ جیسے کسی اجنبی کو دیکھ کر کوئی نظریں جھکا لے۔

میرے سینے میں شعلہ سا لپکا لیکن اس شعلے میں تپش نہ تھی۔ تب ہی تو میرا جسم ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔

شہناز خاموشی سے اس نوجوان کے کندھے سے لگی بیٹھی تھی جو یقیناً اس کا شوہر تھا۔

کہاں گئے، وہ سارے وعدے؟ کہاں گئی وہ ہمت؟ کیا ہوئی وہ بغاوت؟۔

سنو ذکر ہے کئی سال کا کیا ایک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

urdunovelist.blogspot.com

پاگل پھر گا رہا تھا۔ بارش تھم چکی تھی۔ کالے کالے بادلوں سے چاند جھانک رہا تھا۔ دُور گھنٹہ گھر سے پانچ بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ میرا تکیہ بھیگ چکا تھا، شاید میں انجانے میں بہت رویا ہوں۔

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ کہانی جو ابھی ابھی میں نے دہرائی کس کی تھی؟

میری یا پاگل کی؟

یقیناً میری تھی۔ اس کا پاگل سے کیا تعلق! □□

گرفت

آٹھ بج کر پانچ منٹ پر آج اُس ڈرامے کو ٹیلی کاسٹ ہونا تھا جس میں شاکرہ اعجاز نے ایک مظلوم عورت کا کردار کیا تھا۔

یہ شاکرہ اعجاز کا پہلا ڈرامہ تھا۔ ویسے اداکاری سے اُسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ ایک آرٹس کالج میں لیکچرار تھی۔ بطور آرٹسٹ ملک میں جانی پہچانی جاتی تھی۔ اُس کی تصویروں کی نمائش ملک کے کئی شہروں میں ہو چکی تھی۔ اُس کی پینٹنگز کو خاصا سراہا گیا تھا۔ قدرتی مناظر اور انسانی چہرے اس کی تصویروں کے خاص موضوعات تھے۔ اس کے بنائے لینڈ اسکیپ اس قدر جاذب نظر، پرکشش اور حسین ہوتے تھے کہ آدمی تصویر میں گم ہو کر رہ جاتا تھا۔ وہ تصویر کا حصہ بن جاتا تھا۔ انسانی چہرے وہ اتنی چابکدستی سے پینٹ کرتی تھی کہ اُن چہروں پر رقم جذبے بھی عیاں ہو جاتے تھے۔ وہ اپنا کام بہت ڈوب کر کرتی تھی۔

اُس کا شوہر اعجاز صدیقی ٹی وی کا ایک نامور آرٹسٹ تھا اور یہ نام اسے تحفے کے طور پر نہیں مل گیا تھا۔ یہ نام اس نے بڑی محنت سے کمایا تھا۔ اس کی اداکاری کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں بڑی وسعت تھی۔ وہ ٹائپ اداکار نہ تھا کہ کوئی بھی کردار کر رہے ہوں، اپنے بولنے کا ایک خاص لہجہ، اداکاری کا ایک مخصوص انداز نہیں چھوڑتے۔ اعجاز صدیقی ان اداکاروں میں سے تھا

urdunovelist.blogspot.com

جو کرداروں کی روح میں گھس کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر اسی کی حرکات وسکنات کو اپنا لیتے ہیں۔ اُسی کے انداز میں بات کرتے ہیں۔ ورسٹائل اداکار ہونے کی وجہ سے وہ اب تک کئی قابل فخر ایوارڈ حاصل کر چکا تھا۔

آٹھ بج کر پانچ منٹ پر آج جو ڈرامہ ٹیلی ویژن پر دکھایا جانا تھا، وہ ''بندھن'' نامی سیریز کا آخری ڈرامہ تھا۔ اُس ڈرامے کا نام تھا ''آبرو'' یہ ڈرامہ بھی ''بندھن'' کے دوسرے ڈراموں کی طرح عورت کے گرد گھومتا تھا۔ اس کا موضوع بھی عورت کی مظلومیت تھا۔

''آبرو'' کی ہیروئن ایک آرٹسٹ تھی۔ ڈرامے میں اسے بہت معصوم اور پرکشش دکھایا گیا تھا۔ پروڈیوسر اقبال یوسفی کے سامنے جب اس ڈرامے کا اسکرپٹ آیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کیونکہ ٹیلی ویژن پر کام کرنے والی موجود اداکاراؤں میں سے کوئی بھی اس کردار کیلئے موزوں نہ تھی لیکن ہیرو موجود تھا۔ اعجاز صدیقی سے بہتر کوئی اداکار اس کردار کو ادا نہیں کر سکتا تھا۔

اعجاز صدیقی، اقبال کا اچھا دوست تھا۔ اس نے سوچا، اعجاز سے مشورہ لیا جائے۔ یہ سوچ کر وہ اس کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اعجاز صدیقی ایک چھوٹی سی ایڈورٹائزنگ کمپنی کا مالک تھا۔ شاکرہ نے آرٹ کا شعبہ سنبھال رکھا تھا۔ وہ اس کمپنی کی آرٹ ڈائریکٹر تھی جبکہ اعجاز صدیقی نے بزنس کا شعبہ سنبھال رکھا تھا۔ شاکرہ کالج سے فارغ ہو کر اپنی کمپنی میں چلی جاتی تھی۔ جب اقبال یوسفی کا ٹیلی فون آیا تو وہ اس وقت آ کر بیٹھی ہی تھی۔

''یار اعجاز، میں اقبال بول رہا ہوں۔''

''آپ کا اقبال بلند ہو، کہئے کیا حال چال ہیں؟''

''بندھن'' کا آخری ڈرامہ ہے، ہیروئن نہیں مل رہی۔''

''اور ہیرو۔''

''وہ ہے میری نظر میں بلکہ اس وقت میں اسی سے..... مخاطب ہوں۔''

''ہیروئن کیوں نہیں مل رہی؟''

''حاضر اسٹاک میں کوئی بھی اپنے مطلب کی نہیں۔''

''کردار کیا ہے؟''

جواب میں اقبال یوسفی نے اس کے کردار کو پوری تفصیل سے بتایا۔

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔'' اعجاز صدیقی نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''واقعی حاضر اسٹاک میں سے کوئی بھی اس کردار کے لئے مناسب نہیں۔ پھر اب کیا کیا جائے؟''

''یار اعجاز، کیا بھابھی اس کردار کو ادا نہیں کر سکتیں۔'' اقبال یوسفی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''تم شاکرہ کی بات کر رہے ہو؟'' اعجاز صدیقی نے شاکرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میری کیا بات ہو رہی ہے؟'' شاکرہ نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

اعجاز نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اقبال یوسفی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''انتخاب تو تمہارا برا نہیں ہے لیکن شاکرہ کو اس کام کے لئے راضی کرنا دودھ کی نہر نکالنے کے مترادف ہوگا۔ یہ اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہیں اور مجھے بڑی حیران نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ آپ کہیں تو ٹیلیفون انہیں دے دوں؟''

''یہ بات ٹیلی فون پر کرنے کی نہیں۔ میں گھر آ کر بات کروں گا۔''

''ہاں، یہ زیادہ مناسب ہوگا، پھر رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھالو۔''

''ٹھیک ہے، خدا حافظ۔''

''او کے۔'' اعجاز صدیقی نے ریسیور کریڈل پر رکھ کر شاکرہ کو گھور کر دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا۔ ''رات کو اقبال آ رہے ہیں اور آپ کے لئے ایک خبر لا رہے ہیں۔''

''آخر معاملہ کیا ہے اعجاز؟''

''معاملہ وہی آ کر بتائے گا۔''

رات کو جب اقبال یوسفی نے بات چھیڑی تو شاکرہ اداکاری کا ذکر سنتے ہی بھڑک اُٹھی۔ اس نے اقبال کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''اقبال بھائی! آپ تو مجھے معاف ہی رکھیں۔ اس شعبے میں میرے شوہر ہی بہت ہیں۔''

''بھابھی! صرف یہ ڈرامہ کر لیجئے۔ اس کردار میں اور آپ میں بہت مماثلت ہے۔ ہیروئن آرٹسٹ ہے۔ معصوم ہے، بے حد حسین ہے اور یہ سب خوبیاں آپ میں موجود ہیں۔ یہ کردار اگر آپ نے کر لیا تو خدا کی قسم، دھما کا ہو جائے گا۔''

urdunovelist.blogspot.com

''مجھے نہیں کرنا کوئی دھماکا، میں بغیر دھماکے کے ہی بھلی ہوں۔ براہِ کرم آپ اس مسئلے پر اصرار نہ کریں تو میں آپ کی مشکور ہوں گی۔'' شاکرہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

لیکن اقبال یوسفی ہار ماننے والی شخصیتوں میں سے نہ تھا۔ اس نے اعجاز کے گھر کے روز چکر کاٹنا شروع کر دیئے۔ ایک دن وہ شاکرہ کے کالج بھی چلا گیا۔ اعجاز سے بھی سفارش کروائی۔ بالآخر شاکرہ کو پسپا ہونا پڑا۔ وہ اقبال یوسفی کی مستقل مزاجی کے آگے زیادہ دن نہ ٹھہر سکی۔ اس نے گھبرا کر ہامی بھر لی۔ ''آپ کے اصرار سے مجبور ہو کر میں اس کردار کو ادا کرنے کے لئے راضی ہوئی ہوں۔ لیکن ایک بات آپ اچھی طرح سے سمجھ لیجئے کہ مجھے اداکاری بالکل نہیں آتی۔ آپ کو مجھ سے شدید قسم کی مایوسی ہوگی۔''

''ہم آپ سے اداکاری کب کروائیں گے، آپ اعجاز کے ساتھ جس طرح اُٹھتی بیٹھتی، ہنستی بولتی ہیں، بس ویسے ہی کرنا ہوگا۔ البتہ مکالمے ہمارے ہوں گے۔ ہاں، اداکاری اعجاز کو کرنا ہوگی کیونکہ اسکرپٹ کے مطابق وہ ایک غصہ ور اور اکھڑ مزاج شوہر ہیں۔''

''ارے شاکرہ، تم پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ اداکاری میں تمہیں سکھاؤں گا۔'' اعجاز بولا۔

''بس آپ تو خاموش ہی رہیں تو اچھا ہے، یہ سب کیا دھرا آپ ہی کا ہے۔''

''لو بھئی، بلند اقبال، سن لیا تم نے۔ اس معاملے سے اتنا الگ رہنے کے باوجود الزام لگ گیا۔''

''اقبال بھائی! ایک بات اور سن لیں۔ یہ میرا پہلا اور آخری ڈرامہ ہوگا۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔''

''مجھے منظور ہے۔'' اقبال یوسفی نے اقرار کرتے ہوئے کہا۔

آٹھ بج کر پانچ منٹ پر آج یہی ڈرامہ ٹیلی کاسٹ ہونے والا تھا۔ اس وقت پونے آٹھ بجے تھے۔ اعجاز اور شاکرہ نے اپنے مشترکہ دوستوں کو گھر پر مدعو کیا ہوا تھا۔ اقبال یوسفی نے اصرار کر کے یہ دعوت کروائی تھی۔ اس چھوٹی سی محفل میں اقبال کی بیوی شائستہ، شہر کے ایک بڑے وکیل اکرام احمد، ایک مشہور فلم پروڈیوسر مہتاب خاں اور شاکرہ کی دو آرٹسٹ دوست لیلیٰ اور قمر شامل تھیں۔

سب لوگ آ چکے تھے۔ اقبال یوسفی مزے لے لے کر شاکرہ کو اداکاری کے لئے راضی کرنے سے ریکارڈنگ تک کے واقعات حاضرین کو سنا رہا تھا۔ اس کی دلچسپ باتوں سے سب محظوظ

ہو رہے تھے۔

خدا خدا کر کے ٹیلی ویژن پر اشتہارات کا سلسلہ ختم ہوا۔ اناؤنسر نے اسکرین پر نمودار ہو کر ''بندھن'' کے آخری ڈرامے ''آبرو'' کے شروع ہونے کا اعلان کیا۔ تب ہر شخص نے اپنی پسند کی نشست سنبھال لی اور ٹیلی ویژن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شاکرہ پھر بھی چین سے نہ بیٹھی۔ وہ ڈرامے کے دوران اُٹھ اُٹھ کر کچن میں جاتی رہی۔

ڈرامہ بہت اچھا تھا۔ اقبال یوسفی نے خاصی محنت کی تھی۔ شاکرہ کی اداکاری اس ڈرامے کی جان تھی اور اس قدر فطری اداکاری تھی کہ ہر شخص شاکرہ کو داد طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

جب وہ سین آیا تو شاکرہ اُٹھ کر جلدی سے کچن میں چلی گئی۔

اس سین کو ریکارڈ کراتے ہوئے بھی اس کا دل کانپا تھا اور اب بھی وہ خوفزدہ ہو کر ٹی وی کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ کچن میں بھی ٹیلی ویژن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ پاس پڑوس میں بھی ٹیلی ویژن اپنی پوری آواز سے کھلے ہوئے تھے۔

تب اعجاز صدیقی کی انتہائی غصے اور نفرت میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ستارہ! میں نے تجھے طلاق دی۔''

جب تین بار یہ ہیبت ناک آواز گونجی تو شاکرہ کی آنکھوں میں جانے کیوں آنسو آ گئے۔ اس سین کو ریکارڈ کراتے ہوئے بھی وہ خود بخود رو پڑی تھی اور اس فطری انداز میں روئی تھی کہ اقبال یوسفی ششدر رہ گیا تھا۔ اب بھی طلاق کا ذکر سن کر اس کا ہاتھ سینے پر چلا گیا تھا جیسے کسی نے کلیجہ کھینچا ہو اور پلکوں پر آنسو لرزنے لگے تھے۔

''ارے، بھابھی کہاں گئیں؟'' اقبال یوسفی نے ٹیلی ویژن اسکرین سے نظریں ہٹا کر شاکرہ کی خالی نشست کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' اعجاز یہ کہہ کر اُٹھا۔ اس معلوم تھا کہ اس وقت اس کی بیوی کہاں ہوگی؟ وہ سیدھا کچن میں پہنچا۔

''ادھر لوگ تمہاری اداکاری کی تعریفوں کے پل باندھ رہے ہیں اور تم ادھر کچن میں گھسی کباب تل رہی ہو۔ چلو، باہر نکلو، سب اپنے ہی لوگ ہیں، تھوڑی سی دیر ہو جائے گی تو قیامت

urdunovelist.blogspot.com

نہیں آجائے گی۔ آؤ جلدی آؤ۔'' وہ شاکرہ کا ہاتھ پکڑ کر ٹی وی لاؤنج میں لے آیا۔

سب نے اُسے آتا دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجائیں۔ اس کی پُرفارمنس کی داد دی۔ سبھی نے داد دی لیکن اکرام احمد خاموش بیٹھے رہے۔ اس سین کو دیکھ کر اُن کے چہرے پر تفکر آ گیا تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے بقیہ ڈرامہ دیکھتے رہے۔

جب ڈرامہ ختم ہوا تو ہر شخص نے شاکرہ کے کام کی دل کھول کر تعریف کی۔ شاکرہ اپنی معصوم مسکراہٹ کے ساتھ سب سے داد وصول کرتی رہی۔ اکرام احمد اب بھی خاموش بیٹھے تھے۔ وہ کچھ اُلجھے ہوئے سے تھے۔ اعجاز نے انہیں اس طرح خاموش بیٹھے دیکھا تو پوچھا۔

''ہاں جی وکیل صاحب! آپ کیا کہتے ہیں۔ بیچ اس مسئلے کے؟''

''بھائی، کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔''

''کہاں گڑبڑ ہوگئی ہے؟'' اعجاز صدیقی نے حیرت سے پوچھا۔

''فتویٰ لینا پڑے گا۔''

''کس بات کا فتویٰ؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''

''بھائی، اُنہیں کھانا کھلاؤ۔ شاید بھوک زیادہ لگ رہی ہے۔'' اقبال یوسفی نے مذاق اُڑایا۔

''یہ سارا کیا دھرا تمہارا ہی ہے اقبال!''

''ہوا کیا، کچھ بولیں تو؟'' شاکرہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''بھابھی، لگتا ہے آپ کو سچ مچ طلاق ہوگئی ہے۔''

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو اکرام احمد، ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' اعجاز صدیقی نے غصے سے کہا۔

''یہ تو محض ڈرامہ تھا۔''

''لیکن شرع میں کسی کھیل، کسی ڈرامے کی گنجائش نہیں۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔'' اعجاز صدیقی کا ذہن اس بات کو قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تھا۔

''ہاں، قانوناً تو ایسا نہیں ہوا لیکن شرعاً طلاق ہوگئی ہے اور اس کی تصدیق کسی مفتی سے کرنا ہوگی۔'' اکرام احمد نے سنجیدگی سے کہا۔

''خدا کے لئے اکرام، مذاق مت کرو، یہ معاملہ بڑا سنگین ہے۔'' اقبال یوسفی نے التجا کی۔

''یہ معاملہ واقعی سنگین ہے اور ہمیں اسے سنجیدگی سے لینا چاہئے۔'' اکرام احمد نے کہا۔ ''میں ابھی مفتی صاحب سے بات کر کے آپ لوگوں کو بتاتا ہوں، اعجاز، ذرا ٹیلی فون تو لاؤ۔''

''اعجاز! یار اب کھانا نکلواؤ، مجھے تو بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔'' اقبال یوسفی نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔ ''اللہ کسی کو وکیل نہ بنائے اور وکیل بنائے تو کم از کم دوست نہ بنائے۔ انہیں بال کی کھال نکالنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔''

''نہیں، انہیں کر لینے دو اپنی حسرت پوری۔ میں لاتا ہوں ٹیلیفون۔'' اعجاز نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے چند لمحوں میں اکرام احمد کے سامنے ٹیلیفون لا رکھا۔ ''لیجئے حضور، کیجئے اپنی حسرت پوری، لیجئے فتویٰ۔''

اکرام احمد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے جیب سے ایک چھوٹی سی ڈائری نکالی۔ اُس میں سے کوئی نمبر دیکھا اور پھر فون پر ڈائل کرنے لگا۔

محفل پر سناٹا چھا گیا تھا۔ شاکرہ کا دل تو پہلے ہی ڈر رہا تھا۔ اس مسئلے پر اکرام احمد کی سنجیدگی دیکھ کر وہ اندر ہی اندر اور کانپنے لگی۔

اکرام احمد نے مفتی صاحب سے بہت تفصیلی بات کی۔ اُس نے ڈرامے کی پوری کہانی بیان کی۔ پھر وہ الفاظ دُہرائے جو اعجاز صدیقی نے ڈرامے میں کہے تھے۔ اُدھر سے مفتی صاحب نے کچھ سوالات کئے جن کے جوابات اکرام نے دیئے۔ ان سوال و جواب کے بعد جو فتویٰ مفتی صاحب نے صادر کیا، وہ یہ تھا کہ طلاق ہوگئی۔

پھر اکرام احمد نے ریسیور اعجاز صدیقی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اب تم چاہو تو بات کر لو۔''

''نہیں، میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے کیا ضرورت ہے بات کرنے کی۔'' وہ غصے سے بولا۔

''تمہاری مرضی۔'' یہ کہہ کر اکرام احمد نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور خاموشی سے شاکرہ کی طرف دیکھنے لگا۔ شاکرہ کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آ رہے تھے۔ شاکرہ گھبرا کر اُٹھی۔ اُس نے اعجاز صدیقی کا بازو تھام لیا اور جذباتی انداز میں چیخی۔

''نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔''

''اکرام احمد! تم دوست نہیں، دشمن ہو، چلے جاؤ یہاں سے، تم میرا گھر برباد کر دینا چاہتے

urdunovelist.blogspot.com

ہو۔تم نہیں جانتے کہ شاکرہ کی میری زندگی میں کیا اہمیت ہے۔تم مجھ سے کس چیز کا بدلہ لے رہے ہو۔خدا کے واسطے یہاں سے چلے جاؤ، مجھے تمہاری شکل سے بھی نفرت ہوگئی ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں چلا جاتا ہوں لیکن اتنا یاد رکھو کہ میں نے تمہیں سیدھا راستہ دکھایا ہے۔ آگے تمہاری مرضی کہ تم سیدھے راستے پر چلتے ہو یا ٹیڑھا راستہ اختیار کرتے ہو۔" یہ کہہ کر اکرام احمد اُٹھا اور مضبوط قدموں سے چلتا ہوا، کمرے سے نکل گیا۔

اکرام احمد کے جانے کے بعد اعجاز اور اقبال نے اُسے خوب برا بھلا کہا۔لیکن محفل کا بوجھل پن پھر بھی دُور نہ ہوا۔ ہر شخص اپنی جگہ سوچوں میں گم تھا۔کھانا نکالا گیا تو کسی نے دلچسپی سے نہ کھایا۔اقبال یوسفی نے ماحول کو خوشگوار بنانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکا۔لوگوں نے بڑی مشکل سے کھانا زہر مار کیا اور پھر بوجھل قدموں سے ایک ایک کر کے رُخصت ہوگئے۔

"شاکرہ! تم نے کچھ نہیں کھایا؟" سب کے جانے کے بعد اعجاز مخاطب ہوا۔

"میرا جی نہیں چاہ رہا ہے۔اعجاز، یہ سب کیا ہے، کیا واقعی ہمارے درمیان طلاق ہوگئی ہے۔ کیا اس طرح بھی طلاق ہوجاتی ہے؟ اگر ایسا ہوگیا تو ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر کیسے جئیں گے۔" وہ اُس کے سینے پر سر رکھ کر بے تحاشا رونے لگی۔پھر روتے روتے اُس نے سر اُٹھایا اور سسکتے ہوئے بولی۔"میں نے کتنا منع کیا تھا اقبال کو کہ مجھ سے اداکاری مت کراؤ مگر کسی نے میری ایک نہ سنی۔تم بھی اُسی کے ساتھ شامل ہوگئے۔تم دونوں نے مل کر مجھے اداکاری کے لئے مجبور کردیا۔کاش! میں نے تم دونوں کی بات نہ مانی ہوتی۔"

"شاکرہ، کچھ نہیں ہوا۔تم تھوڑا سا کھانا کھالو اور آرام سے سوجاؤ۔"

پھر اعجاز صدیقی نے اُسے زبردستی تھوڑا سا کھانا کھلایا اور نیند کی گولی دے کر اُسے بیڈ پر لٹادیا۔ پر شاکرہ کو نیند کہاں۔"طلاق ہوگئی" کے الفاظ خوفناک صورتیں بنائے اچانک اُس کے سامنے رقص کرنے لگتے۔وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی۔

آج صبح ہی تو وہ ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔

ڈاکٹر فرزانہ نے اُس کا اچھی طرح معائنہ کر کے اسے ایک دھماکا خیز خبر سنائی تھی۔اس خبر کو سن کر وہ ایک دم اُٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تھا۔

"ڈاکٹر فرزانہ! کیا کہا آپ نے؟" اُس نے دوبارہ تصدیق چاہی۔

"شاکرہ صاحبہ! آپ ایک بچے کی ماں بننے والی ہیں۔"

"میں، واقعی!" شاکرہ حیران تھی۔"ماں بننے والی ہوں۔ڈاکٹر فرزانہ! آپ کو سو فیصد یقین ہے کہ ایسا ہی ہے؟"

"جی بالکل، آپ کہیں تو لکھ کر دے دوں۔" ڈاکٹر فرزانہ نے ہنس کر کہا۔"اسی لئے کہتے ہیں کہ اللہ کی ذات سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔اب دیکھئے۔اللہ نے آپ کو بھی ایک بچے سے نواز دیا۔بے شک گیارہ سال بعد نوازا۔شاکرہ، آپ کس قدر خوش نصیب ہیں۔"

یہ ایک ایسی خوش خبری تھی کہ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کلینک سے ہی ٹیلیفون کر کے اعجاز کو اطلاع دے دے۔لیکن پھر اُس نے خود کو روک لیا۔اُس نے سوچا، اعجاز کو ذرا تنگ کر کے یہ خوشخبری سنائے گی۔

وہ حسب معمول دفتر پہنچی۔دفتر پہنچتے ہی وہ سب سے پہلے اعجاز کے کمرے کا رُخ کرتی تھی۔ اس سے دو تین منٹ بات کر کے وہ پھر اپنے کمرے میں آتی تھی۔اعجاز کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اُس کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ ہوتی تھی۔یہ بڑی جان لیوا مسکراہٹ تھی۔اسی مسکراہٹ نے تو اُس کا دل چھینا تھا لیکن آج جب وہ اُس کے کمرے میں داخل ہوئی تو خلافِ معمول اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کے بجائے خاموشی طاری تھی۔وہ بڑی خاموشی سے ایک کرسی گھسیٹ کر اُس کے سامنے بیٹھ گئی۔

اعجاز نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور پھر پریشان ہو کر بولا۔"خیریت؟"

"نہیں، خیریت کہاں؟" وہ ٹھنڈا سانس کھینچ کر بولی۔

"کیا ہوا؟"

"میں آج ڈاکٹر کے پاس گئی تھی، اُس نے اب بالکل مایوس کردیا ہے۔"

"وہ کون ہوتی ہے مایوس کرنے والی۔تم اللہ پر بھروسا رکھو۔" اعجاز نے اُس کی ڈھارس بندھائی۔"اگر ہماری قسمت میں ہے تو ہمیں ضرور ملے گا، اگر نہیں ہے تو نہ سہی، مجھے تو کوئی پریشانی نہیں۔"

urdunovelist.blogspot.com

''لیکن مجھے ہے، میں اپنے اندر ایک خلا سا محسوس کرتی ہوں۔ لگتا ہے، جیسے میں مکمل نہیں ہوئی۔ عورت کی تکمیل ہی بچے کے بعد ہوتی ہے۔''

''یہ فضول بات ہے۔ تم مکمل ہو اور تمہارا کوئی ثانی نہیں ہے۔'' اعجاز نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

''اعجاز، ایک بات بتاؤ۔ پوری ایمانداری سے، دیکھو، جھوٹ مت بولنا۔'' شاکرہ بولی۔

''ہاں، پوچھو، تم جانتی ہو کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔''

''تمہیں بچے کی واقعی خواہش نہیں؟'' اُس نے پوچھا۔

''خواہش اگر ہو بھی تو اُس سے کیا فرق پڑے گا؟'' وہ بولا۔

''اگر تمہیں یہ معلوم ہو کہ دوسری شادی کر کے تمہیں اولاد مل سکتی ہے تب؟'' اُس نے سوال کیا۔

''تب بھی میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔ تمہاری قیمت پر مجھے کوئی چیز قبول نہیں۔ ہماری شادی کو گیارہ سال گزر گئے ہیں۔ اگر مجھے دوسری شادی کرنا ہوتی تو میں کب کی کر چکا ہوتا لیکن میں تمہارے بغیر ایک پل بھی نہیں گزار سکتا۔ البتہ بچے کے بغیر پوری زندگی گزار سکتا ہوں۔'' اُس نے بڑے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''سچ۔'' یہ سن کر شاکرہ پھولی نہ سمائی۔ اعجاز کو واقعی اُس سے سچی محبت تھی۔

''ہاں، بالکل سچ۔'' وہ بولا۔

''پھر اب تم ایک خوشخبری سنو اور یقین کر لو کہ یہ سب تمہارے صبر کا نتیجہ ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''اچھا، ایسی کیا خوشخبری ہو سکتی ہے وہ؟''

''تم، اعجاز صدیقی، تم۔'' یہ کہہ کر شاکرہ رُک گئی۔ پھر اُسے دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ''تم باپ بننے والے ہو۔''

''ارے قسم سے شاکرہ!'' وہ اُٹھ کر اُس کے قریب آ گیا۔

''ہاں، قسم سے اعجاز!'' وہ بھی بے اختیار اُس کے قریب ہو گئی۔

اس خوشخبری کی لہریں ابھی کم نہ ہوئی تھیں کہ اس ڈرامے نے زندگی کے تاروں کو ہلا کر رکھ دیا۔ ایک قیامت تھی جو اُن پر بڑی خاموشی سے ٹوٹ پڑی تھی۔ سوچتے سوچتے، نیند کی گولی نے

اپنا اثر دکھایا اور وہ سو گئی۔

☆.....☆.....☆

ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔

اعجاز صدیقی کی ابھی آنکھ لگی تھی کہ گھنٹی کی آواز سے اُس کی نیند ٹوٹ گئی۔ اُس نے گردن گھما کر گھڑی دیکھی، ساڑھے بارہ کا عمل تھا۔

''اس وقت کون ہو سکتا ہے ٹیلیفون پر؟'' وہ اپنے سر کو جھٹکتا ہوا اُٹھا۔

''ہیلو۔'' اُس نے ریسیور اُٹھایا۔

''اعجاز صاحب سے بات کرنا ہے۔''

''میں بول رہا ہوں۔''

''اعجاز صاحب، میں اس وقت ٹیلیفون کرنے کیلئے معذرت چاہتا ہوں لیکن معاملہ ایسا ہے کہ ٹیلیفون کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ وہ ڈرامہ ''آبرو'' کے سلسلے میں ایک فتویٰ موصول ہوا ہے۔ میں روزنامہ ''قوت'' کا نیوز ایڈیٹر بول رہا ہوں۔ اس فتوے کے مطابق آپ دونوں کے درمیان طلاق مکمل ہو گئی.....''

''وہ طلاق میں نے ڈرامے میں دی ہے۔ شاکرہ کو نہیں دی، ستارہ کو دی ہے اور میرا نام وہاں اعجاز نہیں، افتخار ہے۔ یہ محض ایک ڈرامہ تھا، بس اس سے زیادہ مجھے کچھ اور نہیں کہنا۔'' یہ کہہ کر اُس نے فوراً ریسیور رکھ دیا۔

صبح روزنامہ ''قوت'' نے فتوے کے ساتھ اعجاز صدیقی کا بیان بھی شائع کر دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ اُن کے گھر پر ٹیلیفون پتھر کی طرح برسنے لگے۔

لفظوں کی بارش تھی جو رُکنے کا نام نہ لے رہی تھی۔ لفظوں کے تیر اُن کے کلیجے چھلنی کر رہے تھے۔ لفظ اُن پر کوڑوں کی طرح برس رہے تھے۔ کیا اپنے، کیا پرائے۔ سب ایک ہی بات کہہ رہے تھے۔ وہ بات جسے سن کر اُن کی روح تڑپ اُٹھتی تھی۔

''آپ کو طلاق ہو گئی۔''

''اعجاز صدیقی آپ پر حرام ہو گیا۔''

urdunovelist.blogspot.com

''شاکرہ اب آپ کی نہ رہی، غیر ہوگئی۔''

اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

''نہیں دی میں نے اپنی بیوی کو طلاق، میں شاکرہ کو کیسے طلاق دے سکتا ہوں۔ جس کے بغیر میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا، اُسے بھلا میں کیوں کر طلاق دوں گا۔ خدا کے لئے آپ لوگ ہمیں بھول جائیے، ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیجئے۔''

لیکن اُس کی بات سننے والا کوئی نہ تھا۔ ہر شخص اپنا راگ الاپ رہا تھا۔ جانے کہاں کہاں سے فتوے حاصل کئے جا رہے تھے، لوگوں کو ان دونوں کی کس قدر فکر تھی۔ ہر شخص اُنہیں ہمدردی کے لبادے میں کانٹے چبھو رہا تھا۔

اخبار دیکھ کر اور اب بیسیوں کالیں وصول کر کے انہوں نے خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور اسی رو میں وہ گھر سے باہر نکل آئے تھے۔ اعجاز اُسے کالج کے گیٹ پر چھوڑ کر اپنے دفتر چلا گیا تھا۔

شاکرہ کالج کے گیٹ میں کیا داخل ہوئی، اُسے لگا جیسے کسی جیل میں آ گئی ہو۔ کالج میں اُس کا استقبال بالکل اسی انداز میں ہوا جیسے کسی مجرم کا جیل میں ہوتا ہے۔

عجیب عجیب نظروں سے واسطہ پڑا۔

طرح طرح کے سوالات سننے کو ملے۔

لوگ اس سے ہمدردی کرنے کیلئے آگے بڑھتے مگر اُسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اُس کے دل کے ٹکڑے کر رہے ہوں۔ وہ کالج میں ایک گھنٹہ بھی نہ رہ سکی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اُسے لگا، اگر وہ کچھ دیر اور وہاں رہ گئی تو ہو سکتا ہے، اُس کے دماغ کی رگ پھٹ جائے۔

اُس نے کالج سے روتے روتے اعجاز کو ٹیلیفون کیا۔

''میں گھر جا رہی ہوں، میں یہاں اگر کچھ دیر اور رہی تو مر جاؤں گی۔''

''تم گھر چلو، میں بھی آ رہا ہوں۔ یہاں میرا بھی یہی حال ہے۔ کالوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ لوگ بالمشافہ بھی پُرسہ دینے آ رہے ہیں۔''

''یہ لوگ ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ ہم نے اِن کا کیا بگاڑا ہے؟ طلاق ہوئی ہے یا

نہیں۔ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ ہم جانیں، ہمارا کام جانے۔ اِن لوگوں کو اس معاملے میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟''

''شاکرہ، یہ تماشا پسند قوم ہے اور ہم اس وقت تماشا بنے ہوئے ہیں۔ اچھا خیر، تم پریشان مت ہو، گھر چلو یا تم کالج میں ٹھہر سکتی ہو تو میں خود آ کر تمہیں لے جاتا ہوں۔''

''نہیں، میں یہاں اب ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکتی۔ میری رگوں میں کانٹے چبھ رہے ہیں۔ میں گھر جا رہی ہوں، تم وہیں آ جاؤ۔''

''دیکھو شاکرہ! تم ذرا خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ میرا خیال ہے کہ تم مسلسل روئے جا رہی ہو۔ رونے سے بھلا کیا ہوگا۔ تم ایک سمجھ دار عورت ہو، ذرا حوصلے سے کام لو۔ میں کوئی نہ کوئی راہ نکال لوں گا۔ ہمیں ایک دوسرے سے کوئی جدا نہ کر سکے گا۔ اوکے، خدا حافظ۔''

''اچھا، خدا حافظ، اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' یہ کہہ کر اُس نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور ایک رکشا پکڑ کر اپنے گھر پہنچ گئی۔

اس گھر میں رہتے ہوئے انہیں گیارہ سال ہو گئے تھے۔ وہ اس گھر کی ایک ایک اینٹ سے واقف تھی۔ گیارہ سال پہلے جب وہ دلہن بن کر اس گھر میں آئی تھی، اس وقت سے اب تک اسے نہیں یاد پڑتا تھا کہ وہ اعجاز سے کبھی الگ ہوئی ہو۔ اُس کے والدین اکثر اُسے لینے کے لئے آتے یا فون پر بلاتے۔ وہ ان کے ساتھ چلی جاتی لیکن صرف دن، دن کے لئے۔ رات ہوتے ہی وہ اپنے بسیرے کی طرف لوٹ آتی۔

ان گیارہ برسوں میں شاید ہی کوئی رات ایسی ہو جو اُس نے اعجاز کے ہجر میں گزاری ہو۔

اتنی لمبی رفاقت۔ ایسی ٹھوس محبت، اتنا مضبوط رشتہ یوں کانچ کی طرح چھن سے ٹوٹ جائے گا، اس کا اُسے گمان بھی نہ تھا۔

وہ گھر میں آ کر ایسے ہی کٹی پتنگ کی طرح اِدھر سے اُدھر ڈولتی پھری۔ وہ گھر کی ایک ایک چیز کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ جانے کیوں، اُس کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ وہ اِس گھر کو، اس گھر کی چیزوں کو آخری بار دیکھ رہی ہے۔

پھر نڈھال ہو کر بیڈ پر گری اور سسکیوں سے رونے لگی۔

urdunovelist.blogspot.com

تب ہی ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اس نے اپنی سسکیوں کو روکتے ہوئے ریسیور اُٹھایا اور دھیرے سے بولی۔ ''ہیلو۔''

''ارے، میری جان! تم کہاں ہو؟ میں کئی بار ٹیلی فون کر چکی ہوں۔ پہلے گھر کیا، یہاں سے کسی نے نہیں اُٹھایا تو سوچا کہ کہیں تم کالج نہ چلی گئی ہو، وہاں ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کہ تم گھر چلی گئی ہو۔ شاکرہ، یہ کیا ہو گیا۔ یہ تم نے کیا کر لیا؟''

''ہائے ممی! میں کیا بتاؤں، مجھے لگتا ہے، جیسے میں زندہ جلائی جا رہی ہوں۔''

''یہ حماقت تو تمہاری اپنی ہے، تمہیں کس نے کہا تھا ڈرامے میں کام کرنے کو؟''

''بس ممی! ہو گئی حماقت، اب کیا ہو سکتا ہے؟''

''ہاں، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تمہارے پاپا نے اچھی طرح کئی علمائے دین سے معلوم کر لیا ہے۔ طلاق ہو چکی ہے۔ اب تم لوگوں کا اکٹھا رہنا مناسب نہیں۔ میں اور تمہارے پاپا تمہیں لینے آ رہے ہیں۔ تم اپنا سامان باندھ کر تیار ہو جاؤ۔'' شاکرہ کی ممی نے کہا اور ٹیلیفون بند کر دیا۔

''نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں جیتے جی اُس سے کس طرح الگ ہو سکتی ہوں؟'' شاکرہ نے سوچا۔ پھر وہ گھبرا کر اعجاز کو ٹیلیفون کرنے لگی۔

''ہیلو۔'' اُس نے بڑی بے تابی سے کہا۔

''جی، فرمایئے۔'' اُدھر سے کوئی اور بول رہا تھا۔ وہ اعجاز نہ تھا۔

''دیکھئے، میں مسز اعجاز بول رہی ہوں، اعجاز صاحب کہاں ہیں؟''

''جی، وہ تو کافی دیر کے یہاں سے نکلے ہوئے ہیں۔ شاید گھر ہی گئے ہیں۔''

''اچھا، ٹھیک ہے۔'' شاکرہ نے مایوسی سے کہا اور کریڈل پر ریسیور ڈال دیا۔

ریسیور رکھتے ہی باہر گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے باہر کی طرف بھاگی۔ اعجاز گاڑی لاک کر رہا تھا کہ وہ دوڑ کر اُس سے لپٹ گئی اور اُس کے سینے میں منہ چھپا کر سسکنے لگی۔

''یہ دنیا والے مجھے تم سے الگ کر دینا چاہتے ہیں اعجاز، بتاؤ، میں تمہارے بغیر کیسے زندہ رہوں گی؟ میں مر جاؤں گی۔''

''تم فکر مت کرو، تمہیں مجھ سے کوئی جدا نہ کر سکے گا۔''

''ممی کا فون آیا تھا۔ پاپا نے ساری تحقیق کر لی ہے۔ وہ دونوں مجھے لینے آ رہے ہیں اور تم کہتے ہو کہ ہمیں کوئی جدا نہ کر سکے گا۔''

''میرے پاس بھی ڈیڈی کا فون آیا تھا، ان کے خیال کے مطابق اب ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہنا چاہئے۔ تمہیں اپنے ماں باپ کے گھر چلا جانا چاہئے۔ ڈیڈی بھی آنے والے ہیں۔''

''پھر تم نے کیا سوچا؟''

''میں نے جو سوچا ہے، وہ میں تمہیں اندر چل کر بتاتا ہوں۔ تمہیں جلد از جلد سامان باندھنا ہوگا۔''

پندرہ بیس منٹ میں انہوں نے دو سوٹ کیس تیار کر لئے۔ ان سوٹ کیسوں میں نقدی اور زیورات تھے۔ کچھ ضروری کاغذات تھے اور چند جوڑے تھے۔

اعجاز صدیقی نے دونوں سوٹ کیسوں کو ڈگی میں رکھا۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر پورے گھر کا چکر لگایا۔ جانے کتنے منظر اُن کی آنکھوں میں اُبھر کر ڈوب گئے۔ اس گھر کے در و دیوار پر خوشیوں کے موتی ٹنکے تھے۔ وہ ان موتیوں کی چمک ماند پڑتے دیکھ کر اس گھر سے نکل آئے۔ گھر کو تالا لگایا۔ دونوں نے اُسے خدا حافظ کہا اور پھر آنکھوں میں آنسوؤں کی مالا لئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔

اُنہوں نے ایک عجیب و غریب فیصلہ کیا تھا۔

اس کے سوا اب کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

وہ ایک دوسرے سے الگ ہونا نہیں چاہتے تھے اور اس گھر میں وہ اب کسی قیمت پر اکٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔

اُن کی گاڑی بڑی برق رفتاری سے گرجا کی طرف بڑھ رہی تھی۔

وہاں پادری سالومن اُن کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

ایک فیصلہ انہوں نے اپنے بارے میں کیا تھا تو ایک فیصلہ تقدیر نے اُن کے بارے میں کیا تھا۔

صبح کے اخبارات اُن کے بارے میں بڑی ہولناک خبریں لے کر آئے۔ تیز رفتاری کی وجہ سے اُن کی گاڑی ایک سامان سے لدے ہوئے ٹرک سے ٹکرائی اور وہ دونوں موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے۔

□□

urdunovelist.blogspot.com

ناممکن

میں بہت تیزی سے اپنی بلڈنگ کی سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر پہنچا۔ تیسرے فلور پر بیس نمبر کا فلیٹ میرا تھا۔ مجھے یہ فلیٹ بہت پسند تھا۔ ایک تو یہ کہ بہت اچھا بنا ہوا تھا۔ دوسرے اس کا کرایہ مناسب تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ میرے آفس سے بہت قریب تھا۔ لیکن میری بیوی کو یہ فلیٹ قطعی پسند نہ تھا وہ اس فلیٹ کو منحوس قرار دے چکی تھی کیونکہ اس فلیٹ میں آئے ہوئے ہمیں تین سال ہو چکے تھے اور جب سے ہم اس فلیٹ میں آئے تھے۔ ہمارے خاندان میں کسی نئے فرد کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کا سبب یہ غریب اینٹ پتھروں سے بنا مکان نہ تھا بلکہ اس کا ذمہ دار میں تھا اور میری بیوی ان حقائق سے ناواقف تھی۔

سو سے زائد سیڑھیاں اس قدر عجلت میں چڑھ کر میں نے اپنی جان پر واقعی ظلم کیا تھا۔ اب میں فلیٹ کے دروازے پر کھڑا بے طرح ہانپ رہا تھا۔ دو چار لمبے لمبے سانس لے کر میں نے سانس درست کرنے کی کوشش کی۔ پھر اپنے مخصوص انداز میں فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ فوراً ہی اندر سے میری بیوی کے بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی بچوں کا شور گونجا۔ ''پاپا آ گئے۔ پاپا آ گئے۔''

دروازہ کھلتے ہی بچوں کا شور طوفان کی طرح باہر آیا۔ پھر مجھے اپنی بیوی کی ہنستی مسکراتی صورت

دکھائی دی۔ میری بیوی میں جہاں اور بہت سی خوبیاں تھیں وہیں یہ بات بھی تھی کہ اس کے ہونٹوں پر سدا مسکراہٹ رہتی تھی۔ میں نے اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے کبھی خالی نہیں دیکھے۔ اوّل تو میری بیوی کو رونے کا شوق ذرا کم ہی تھا اور اگر وہ کسی ناجائز (اس کے خیال میں جائز) بات پر جھگڑ کر رو بھی پڑتی تو وہ مجھے ہنستی ہوئی دکھائی دیتی اور یہ بات جان کر کہ میں اس کے رونے کو ہنسنا سمجھتا ہوں، وہ مزید بگڑ جاتی۔

میرے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ دیکھ کر بچوں نے ''پاپا آ گئے'' کا نعرہ ترک کر کے ''آہا لڈو آ گئے'' کا نعرہ لگانا شروع کر دیا۔ میں نے سب سے پہلے اپنی تین سالہ بچی غزالہ کے پھول جیسے گالوں پر پیار کیا۔ پھر ساجد اور وقار کو چوما اور مٹھائی کا ڈبہ کھول کر میز پر رکھا اور بچوں سے کہا۔ ''بچو! کھاؤ مٹھائی۔'' لیکن میری سلیقہ مند بیوی نے بڑی پھرتی سے مٹھائی کا ڈبہ بچوں کے سامنے سے کھینچ لیا اور تنک کر بولی۔ ''اوں ہوں۔ کیا کرتے ہیں ساری مٹھائی خراب ہو جائے گی اس طرح۔''

پھر اس نے تین برابر کے حصے کئے اور چھوٹی پلیٹوں میں لگا کر بچوں کے سامنے رکھے۔ اس کے بعد بچوں کے باپ کے سامنے ڈبہ رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ آپ کا۔ ویسے یہ مٹھائی ہے کس سلسلے میں اور یہ آج آپ ضرورت سے زیادہ خوش کیوں دکھائی دے رہے ہیں۔ ذرا جلدی سے بتائیے۔''

''بتاتا ہوں۔ ذرا ادھر تو آؤ۔'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔

''بس بھئی دور سے۔'' وہ پھسل گئی۔

''خوشخبری سننی ہے تو قریب آنا پڑے گا۔ نہ صرف قریب آنا پڑے گا بلکہ ہونٹوں کی شیرنی بھی چکھانی پڑے گی۔''

''نہیں جناب، شیرنی آج کل بہت مہنگی ہے۔''

''چلو، ایک گلاب جامن کھا لو۔''

''گلاب جامن تو خیر میں کھاؤں گی۔ آپ خوشخبری تو سنائیں اچھا ایسا کریں ایک خوشخبری آپ سنائیں ایک میں سناتی ہوں، حساب برابر ہو جائے گا۔''

''ٹھیک ہے پہلے تم سناؤ۔''

''نہیں پہلے آپ۔''

urdunovelist.blogspot.com

''نہیں پہلے تم۔''

''نہیں پہلے آپ۔ اے غزالہ کی بچی ہاتھ فراک سے مت پونچھو۔''

''اے غزالہ کی ماں۔ میری ترقی ہوگئی ہے۔ میں کل سے سیکشن انچارج ہوگیا ہوں اور پانچ سو روپے تنخواہ بڑھ گئی ہے۔''

''ہائے، مبارک ہو۔'' وہ غیر شعوری طور پر میرے قریب آگئی۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا تو وہ کٹی پتنگ کی طرح میری گود میں آگری۔ بچے مٹھائی کھانے میں مشغول تھے اس لئے میں نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ وہ ''ارے، ارے'' کرتی رہ گئی۔

''ہاں جی۔ اب ہو جائے آپ کی خوشخبری۔''

''جائیے۔ میں کچھ نہیں بتاتی۔''

''تمہارے پاس تھا ہی کیا بتانے کو۔ یونہی ہوا میں تیر چلا رہی تھیں۔''

''اجی ہاں، میرے پاس ایسی خوشخبری ہے کہ سنیں گے تو پھڑک اُٹھیں گے۔''

''آج مچھلی تو نہیں پکالی۔''

''لاحول ولا۔ ہر وقت کھانے کی بات۔ معلوم بھی ہے۔ میں، میں۔ اللہ ہم سے نہیں کہا جاتا۔''

یہ کہہ کر وہ کچھ اس انداز سے شرمائی کہ میں سوچ میں پڑ گیا۔ ایک ایسی سوچ جس میں خوف شامل تھا۔ کیا میری بیوی؟ نہیں! اس سے آگے میں نہ سوچ سکا۔ ''صاف، صاف کہو۔ کیا بات ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''میں ماں بننے والی ہوں۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ پھر آپ ہی آپ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''کیا کہا؟'' یہ سنتے ہی میرے اندر ہزاروں آتش فشاں پھٹ پڑے۔ میں نے لپک کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ اس کی ہنسی حلق میں پھنس کر رہ گئی اور چہرے پر ایک بے نام سا جذبہ لہرانے لگا۔ ''بتاؤ۔ اس بچے کا باپ کون ہے؟'' میں نے اس کا گلا مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

''آپ، آپ ہیں۔''

''میں پوچھتا ہوں۔ اس بچے کا باپ کون ہے؟''

''آپ کے علاوہ بھلا اور کون ہو سکتا ہے؟'' اس کی آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔

''بکواس مت کرو۔ اس شخص کا نام بتاؤ۔''

''آ۔ آ۔ آ۔ آپ۔'' اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ میرے ہاتھوں کا دباؤ بڑھتا ہی گیا۔ آخر وہ سرد ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

''میں نہیں جانتا یہ سب کیسے ہوا۔ میرے ناتواں ہاتھوں میں اتنی قوت کہاں سے آگئی۔ بہر حال میری بیوی میرے ہاتھوں قتل ہوئی یہ حقیقت ہے۔ اور اسے قتل کر کے میں قطعی پشیمان نہیں۔ اس کے جرم کی یہ مناسب ترین سزا تھی۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے اس کا گلا قتل کرنے کے ارادے سے نہیں دبایا تھا۔'' میں نے پولیس افسر کے سامنے اپنی صفائی پیش کی۔

''خیر آپ نے اپنی بیوی کا گلا شدت جذبات سے مغلوب ہو کر دبایا ہو یا قتل کرنے کے ارادے سے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کی بیوی آپ کے ہاتھوں قتل ہوئی۔ ہمیں صرف اس سے سروکار ہے۔ اپنے جرم کا اقرار آپ خود بھی کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ابھی تھوڑی دیر میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی آنے والی ہے۔ اس سے بھی یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ مقتولہ کی موت کس طرح واقع ہوئی۔ اب میں آپ سے۔'' انسپکٹر ہربنس کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سگریٹ۔''

میں نے پیکٹ سے ایک سگریٹ کھینچ لیا اور ہونٹوں میں دبا کر شعلے کا انتظار کرنے لگا۔ انسپکٹر ہربنس نے لائٹر جلا کر میرا سگریٹ سلگایا۔ میں نے ایک لمبا کش لیا اور دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

''جی آپ کچھ فرما رہے تھے۔''

''کیا واقعی آپ نے اپنی بیوی کو صرف اس لئے قتل کر دیا کہ وہ ماں بننے والی تھی۔ ابھی ابھی آپ نے اپنے بیان میں یہ بات کہی ہے کہ آپ کی بیوی اس فلیٹ کو منحوس سمجھتی تھی کیونکہ اس فلیٹ میں آنے کے بعد اس کے یہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ ٹھیک ہے اور بچہ پیدا نہ ہونے کا سبب آپ کے خیال میں یہ فلیٹ نہ تھا بلکہ کچھ اور حقائق تھے جن سے آپ کی بیوی ناواقف تھی۔ میں ان حقائق سے واقف ہونا چاہتا ہوں جن کی بناء پر آپ کی بیوی کیلئے اُمید سے ہونا ممکن نہ تھا۔'' انسپکٹر ہربنس نے ایش ٹرے

urdunovelist.blogspot.com

میں گل جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ سب سے پہلے مجھے یہ بتائیں کہ آپ کے کتنے بچے ہیں؟''

''جی تین۔ ایک لڑکی، دو لڑکے۔ سب سے بڑے لڑکے کا نام وقار ہے اور عمر پانچ، اس سے چھوٹا بھی لڑکا ہی ہے، چار سال کا ہے وہ۔ پھر ایک بچی ہے تین سال کی۔'' میں نے بچوں کی تفصیلات بتائیں۔

''آپ کی شادی کب ہوئی تھی؟''

''میری شادی کو یوں سمجھئے سات سال ہو گئے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ بچے شروع کے تین سالوں میں ہوئے، ہر سال ایک بچہ۔ پھر تین سال تک کوئی بچہ نہ ہوا۔ اور جب تین سال کے بعد آپ کی بیوی نے حاملہ ہونے کی خوشخبری سنائی تو آپ نے اسے قتل کر دیا۔ آخر کیوں؟''

''اس لئے کہ وہ بچہ میرا نہیں تھا۔''

''آپ کے خیال میں وہ بچہ کس کا تھا؟''

''یہی معلوم کرنے کیلئے میں نے اس کا گلا دبایا تھا لیکن اس نے کچھ اُگل کر نہیں دیا۔ یہاں تک کہ وہ سرد ہو گئی۔''

''کیا آپ کو اپنی بیوی کے چال چلن پر شبہ تھا؟''

''نہیں، میں نے کبھی اس میں ایسی ویسی بات نہیں دیکھی جس کی بناء پر میں یہ کہہ سکوں کہ میری بیوی بدچلن تھی لیکن اس کا حاملہ ہونا ہی اس کی بدچلنی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔'' میں نے دلیل پیش کی۔

''آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ بچہ آپ کا نہیں تھا۔''

''وہ بچہ یقیناً میرا نہیں تھا۔ دراصل میں اب اس قابل ہی نہیں۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' انسپکٹر ہربنس نے پہلو بدلا۔

''میں اپنا آپریشن کروا چکا ہوں، انسپکٹر۔''

''اوہ۔ یہ آپریشن آپ نے کب کروایا۔''

''اب سے تین سال پہلے۔ اپنی چھوٹی بیٹی غزالہ کی پیدائش کے بعد۔''

''لیکن کیوں؟''

''بات دراصل یہ ہے انسپکٹر کہ میں بنیادی طور پر اصولی آدمی ہوں اور زندگی کو نپے تلے انداز میں گزارنے کا قائل۔'' میں نے انسپکٹر ہربنس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''شادی سے پہلے ہی میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اپنے یہاں تین بچوں سے زیادہ نہ ہونے دوں گا۔ اس لئے کہ میں نہ لکھ پتی ہوں، نہ کروڑ پتی۔ ایک اوسط درجے کا آدمی ہوں۔ سفید پوش آدمی جس کی تنخواہ کا تیسرا حصہ مکان کے کرائے کی نذر ہو جاتا ہے۔ ایسے آدمی کے یہاں اگر چھ سات بچے ہو جائیں تو وہ کیا اپنی بیوی کو خوش رکھے گا؟ کیا اپنے بچوں کو اوڑھا پہنا سکے گا؟ کیا خود کھا پی سکے گا؟ پھر دوست احباب اور عزیز و اقارب الگ، کسی کے یہاں شادی ہے، کسی کے یہاں سالگرہ ہے۔ کسی کے ہاں کچھ اور..... وہ کیا لے کر جائے گا اور کیسے جائے گا۔ انسپکٹر اپنے گھر کے آگے بچوں کی لائن لگانا کتنا آسان ہے۔ لیکن انہیں اچھی خوراک، اچھا لباس اور اچھا اسکول مہیا کرنا کتنا مشکل۔ نہیں یہ باتیں مجھے خاندانی منصوبہ بندی والوں نے نہیں بتائیں۔ یہ سب سامنے کی باتیں ہیں اور کوئی بھی شخص ان باتوں کو سوچ سکتا ہے۔ شادی کے بعد میں نے کوشش کی کہ کم از کم تین سال کا وقفہ رہے لیکن یہاں بھی ناکام رہا۔ میں نے ہر طریقہ آزما ڈالا لیکن مجبوری اور اتفاقات نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ یہاں تک کہ تیسرا بچہ بھی عالم وجود میں آ گیا۔ میری بیوی ہر پابندی کے سخت خلاف تھی اگرچہ اوپر تلے تین بچے ہو جانے کی وجہ سے وہ بھی پریشان تھی لیکن اتنی پریشان نہیں جتنا میں تھا اور اب میرے سامنے بچوں کی مصیبت سے چھٹکارا پانے کا ایک ہی حل تھا کہ میں اپنا آپریشن کروا لوں۔ سو میں نے کروا لیا اور بیوی کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ پھر ہم اس فلیٹ میں اُٹھ آئے اور یوں میری بیوی نے اس فلیٹ کو منحوس سمجھ لیا اور وہ اصل حقائق جاننے سے قاصر رہی۔ ویسے اس آپریشن سے مجھے دہرا فائدہ ہوا ایک تو میں بچوں کی مصیبت سے بچا اور دوسرے میری بدچلن بیوی کا چہرہ میرے سامنے بے نقاب ہو گیا۔ آپ نہیں جانتے انسپکٹر کہ مجھے اپنی بیوی سے کتنی محبت تھی لیکن آج ہر عورت مجھے زہر کی پوٹلی لگتی ہے۔ اچھا ہی ہوا جو وہ میرے ہاتھوں قتل ہو گئی۔'' میں نے یہ کہہ کر سر جھکا لیا۔

انسپکٹر نے میرے اس تفصیلی بیان کے بعد پھر کوئی اور سوال نہیں کیا۔ البتہ اس کا چہرہ سوچ میں ضرور ڈوب گیا تھا۔ مجھے ایک اور سگریٹ پلا کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

urdunovelist.blogspot.com

دوسرے دن پولیس نے مجھے سول اسپتال بھیج دیا۔ وہاں سرجن نے میرا بغور معائنہ کیا۔ میں نے اس عجیب وغریب معائنہ کا مقصد جاننے کی لاکھ کوشش کی لیکن کسی نے کچھ بتا کر نہ دیا۔ میں نے یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لی کہ جو کچھ ہو چکا ہے وہ میرا مقدر تھا اور اب جو کچھ ہونے والا ہے وہ بھی میری تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔ مجھے اب پھانسی کے پھندے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ کوئی نہیں۔

اس شام انسپکٹر ہربنس نے خود اپنے ہاتھوں حوالات کا تالا کھولا۔ میں گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ تالا کھلنے کی آواز پر میں نے سر اوپر اُٹھایا تو انسپکٹر نے مجھے اشارے سے باہر آنے کو کہا۔ میں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ میں اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے میری طرف سگریٹ کا پیکٹ بڑھایا۔ زبان سے کچھ نہ بولا۔ میں نے شکریہ کہہ کر ایک سگریٹ نکال لیا۔

''تم سے ایک بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔'' انسپکٹر ہربنس نے میرا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

''انسپکٹر جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب اس کو بار بار دہرانے سے کیا فائدہ۔''

''تم نہیں جانتے کہ تم نے کتنا بڑا دھوکا کھایا ہے۔''

انسپکٹر خدا جانے کیا کہنا چاہتا تھا۔ ''یعنی'' میں نے آگے جھکتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے جس بچے کی بناء پر اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔ وہ تمہارا اپنا بچہ تھا۔''

''یہ ناممکن ہے۔'' میں تقریباً چیخ پڑا۔

''سول سرجن کی رپورٹ کے مطابق تم میں بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت بدستور موجود ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے اپنا آپریشن کروایا تھا لیکن کسی اناڑی ڈاکٹر سے۔ آپریشن غلط ہوا تھا۔''

''اگر آپریشن ناکام رہا تھا تو پھر میرے یہاں تین سال تک بچہ کیوں پیدا نہیں ہوا۔'' میں اتنا بڑا صدمہ برداشت کرنے کے قابل نہ تھا۔ میں نے جرح کی۔

''یہ سب بھگوان کی لیلا ہے۔ وہ دینے پر آئے تو ہر سال دے اور روٹھ جائے تو تین سال تک روٹھا رہے۔ کوئی اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ انسان اس کے سامنے کتنا بے بس ہے۔'' انسپکٹر ہربنس نے کہا۔ ''تم مجھے اس ڈاکٹر کا نام پتہ بتاؤ تاکہ اسے گرفتار کیا جا سکے۔ اس کے اناڑی پن نے ایک معصوم

عورت کی جان لے لی۔ میں اسے ضرور سزا دلوا کر رہوں گا۔ اس کے علاوہ تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں پھانسی کے پھندے سے بچا لوں گا۔ بہرحال سزا ضرور ہوگی۔''

انسپکٹر نے مجھے تسلی دینی چاہی۔

''نہیں، انسپکٹر مجھے پھانسی سے کم کی سزا منظور نہیں۔ میں نے اپنی معصوم بیوی کو نہیں بلکہ ایک ماں کو قتل کیا ہے۔ اب میں اس کے بچوں کی دنیا میں واپس جانا نہیں چاہتا مجھے پھانسی دلوا دو انسپکٹر۔'' میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور انسپکٹر میرے شانے تھپتھپانے کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔ □□

urdunovelist.blogspot.com

آدھا مکان

اتوار کو صبح ہی صبح کسی نے گھنٹی بجائی۔ گھنٹی کی آواز سن کر خالہ جان نے دروازہ کھولا۔ راغب کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر خالہ جان کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔

''آؤ بیٹا۔''

راغب نے اندر آتے ہوئے انہیں سلام کیا، مزاج پوچھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تو لوگ سو رہے ہوں گے۔''

''ہاں ظاہر ہے جب رات کے دو بجے تک ہنگامہ کریں گے تو پھر صبح جلد آنکھ کس طرح کھلے گی۔'' خالہ جان نے ناگواری سے کہا۔

''تو کیا ہوا؟ سونے دیجئے۔ اتوار کو دیر تک سونا ہی اچھا لگتا ہے۔''

''پھر تم کیوں نہیں سوئے۔''

''میرے پاس ایک ہی دن چھٹی کا ہوتا ہے اگر وہ بھی سو کر گزار دوں تو پھر لوگوں سے ملوں کس وقت؟''

ٹنکو خالہ جان کے ساتھ ہی اُٹھنے کا عادی تھا۔ اس وقت وہ کاغذ پنسل لئے کوئی شاہکار تخلیق کر رہا تھا۔ راغب کو آتا دیکھ کر پہلے تو اُس نے اپنی توتلی زبان میں ''چھپا مالے تم'' پیش کیا اور پھر راغب کا

جواب سنے بغیر وہ کمرے کی طرف بھاگا۔

سوتی ہوئی عصمت کا لحاف پلٹ کر، اس نے اس کے چہرے کو اپنے ننھے منے ہاتھوں سے دبایا اور پھر اسے ہلاتے ہوئے بولا۔ ''باجی! باجی!''

''کیا ہے ٹنکو؟'' عصمت نے آنکھیں کھولے بغیر اسے اپنی بانہوں میں لپیٹ لیا۔

''مجھے چھوڑو۔'' ٹنکو کا سانس گھٹنے لگا۔ عصمت نے اس کے رخسار چوم کر گرفت ڈھیلی کر دی۔

''اٹھو، اُٹھو۔''

''کیوں، اُٹھو؟''

''ارے، رادب بھائی آئے ہیں۔''

''اللہ، ان راغب بھائی کو چین نہیں، صبح ہی صبح آ ٹپکے۔ پتا نہیں رات کو سوئے بھی تھے کہ نہیں۔'' عصمت نے لحاف اوپر کھینچتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ٹنکو تم چلو میں آتی ہوں۔''

پھر ایک ایک کر کے گھر کے افراد اُٹھتے گئے۔ جو بھی اُٹھتا آنکھیں ملتا ہوا، پہلے راغب کے پاس آتا۔ ''ہلو، ہلو۔'' کے بعد پھر باتھ روم کا رخ کرتا۔ عصمت آئی تو اس نے محسوس کیا کہ وہ سیدھی بستر سے نکل کر آنے کی بجائے باتھ روم سے ہو کر آئی ہے۔ دھلا دھلایا چہرہ، کسی حد تک سنورے بال کہ عجلت میں اتنا ہی کچھ ہو سکتا تھا۔ اس بات کے گواہ تھے۔

راغب کو لاہور سے آئے ہوئے اگرچہ کافی عرصہ ہو چکا تھا لیکن اس گھرانے کیلئے وہ اب تک اجنبی یا یوں کہئے کہ غیر غیر سا تھا وہ خود آگے بڑھ کر ملنے کا عادی نہ تھا اور اس گھر میں بلاوجہ دوسروں کو لپٹانے کی کسی میں عادت نہ تھی۔ لے دے کے خالہ جان ہی ایسی تھیں جو اس پر توجہ دے لیتی تھیں۔ شاید اسی لئے اس کی ماں نے چلتے وقت ہدایت کی تھی۔ ''بیٹا، جلد سے جلد، اپنے الگ رہنے کا انتظام کر لینا۔''

ماں کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے کراچی پہنچتے ہی اپنے الگ رہنے کا انتظام کر لیا تھا۔ خالہ کے گھر اس نے مشکل سے ایک ہفتہ گزارا ہوگا اور اس ایک ہفتے میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی ماں نے بیگانے شہر میں تنہا رہنے کے لئے کیوں کہا تھا جو لوگ اپنے ہوں اور اپنے ہونے کی گواہی نہ دیں، ان کے ساتھ رہنے سے فائدہ۔

urdunovelist.blogspot.com

لاہور سے ساتھ لائے سفارشی خط نے تیر کی طرح کام کیا تھا۔ اس سفارشی خط کی بدولت اسے فوراً ہی بینک میں افسری مل گئی۔ کچھ عرصے کی ٹریننگ کے بعد اسے بولٹن مارکیٹ کی برانچ میں چارج سنبھالنے کو کہا گیا۔ آج کل وہ بولٹن مارکیٹ کی برانچ میں لگا ہوا تھا اور اپنی سروس سے بڑی حد تک مطمئن تھا ہاں، آنے جانے کی البتہ پریشانی تھی۔ کورنگی سے ٹاور پہنچنا کوئی آسان کام نہ تھا اور وہ بھی بس کے ذریعے۔ آنے جانے میں دو تین گھنٹے ضائع ہو جاتے۔ بینک وقت پر پہنچنے کیلئے اسے صبح سویرے گھر سے نکلنا پڑتا۔ پھر بس پکڑنے اور بس میں سوار ہونے کے بعد جتنے دھکے کھانے پڑتے وہ الگ۔ اب وہ ان دھکوں سے تنگ آ گیا تھا، چاہتا تھا کہ کسی اچھے علاقے میں گھر مل جائے تاکہ وقت کی بچت ہو اور سواری کا مسئلہ بھی حل ہو جائے۔ آج وہ صبح ہی صبح اس مشن پر نکلا تھا۔

دس بجے کے قریب ناشتے کا اعلان ہوا۔ راغب گھر سے ناشتہ کر کے چلا تھا لیکن خالہ جان کے اصرار پر اسے ناشتے کی میز پر بیٹھنا پڑا اور انہی کے پرزور اصرار پر اسے تھوڑا بہت کھانا بھی پڑا۔ یوں اصرار عصمت نے بھی کیا لیکن رسمی اصرار کے جواب میں وہ رسمی شکریہ ہی ادا کر سکتا تھا۔ سو اس نے ایسا ہی کیا۔

ناشتہ ختم ہونے کے بعد جب عصمت نے پلیٹیں اُٹھانی شروع کیں تو راغب نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے دس ہونے والے تھے۔ گیارہ بجے اسے ایک دوست کے ہاں پہنچنا تھا اور میز سے اُٹھنے کا یہ بہترین موقع تھا کیونکہ خالہ جان کی داستان گوئی چند لمحوں کے لئے رک گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میز صاف ہوتے ہی خالہ جان ہزاروں مرتبہ کی سنی باتوں کا پٹارا، پھر سے کھولتیں۔ راغب نے بڑی صفائی سے جانے کی اجازت چاہی۔

''اچھا خالہ جان اجازت۔''

''ارے بیٹھو، ابھی آئے ہوئے تمہیں دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔''

''خالہ جان، آج مجھے کئی جگہ جانا ہے، ورنہ ضرور بیٹھتا۔'' راغب کھڑا ہو گیا۔

''افو، تم تو ایک دم ہی کھڑے ہو گئے۔ اچھا کھانا کھا کر چلے جانا۔''

''اتنا کھانے کے بعد اب کھانے کی گنجائش کہاں رہی۔''

''تمہیں جانا کہاں ہے؟''

''میں دراصل آج مکان کی تلاش میں نکلا ہوں۔''

''کیوں، اس مکان کا کیا ہوا؟''

''میں اُس مکان سے اُکتا گیا ہوں۔ اس قدر دور ہے کہ میں ڈرتا ہوں کہ میری زندگی صرف بسوں کے سفر میں ہی نہ کٹ جائے۔''

''زندگی بھی تو ایک سفر ہے راغب بھائی۔ آپ سفر سے اتنا کیوں ڈرتے ہیں۔'' عصمت میز صاف کرتے ہوئے اچانک ہی بول پڑی۔

راغب نے گردن گھما کر اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ عصمت کی آنکھوں پر فوراً ہی پلکوں کی چلمن گر گئی۔ وہ بولا۔ ''آج کل بہت افسانے پڑھے جا رہے ہیں کیا؟''

''کیوں؟'' شاید وہ اس کے سوال میں چھپے ہوئے طنز کو سمجھ نہ سکی۔

''تم نے اچھا ذکر چھیڑا راغب، سنو، تمہیں ایک بات بتاؤں۔'' خالہ جان نے عصمت کی طرف دیکھا۔

''ارے چھوڑیئے بھی امی، آپ تو خواہ مخواہ.....''

''نہیں خالہ جان بتایئے۔'' راغب بضد تھا۔

''اس کا ایک افسانہ چھپا ہے۔'' خالہ جان نے انکشاف فرمایا۔

''اچھا..... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ دکھایئے کہاں ہے وہ افسانہ، ہم بھی تو پڑھیں۔''

''آپ کیا کریں گے پڑھ کے..... آپ تو حسابی کتابی آدمی ہیں۔'' اب اسے اپنے طنز کا جواب ملا۔

اور اسی لمحے عصمت، اُسے پہلی بار اپنی اپنی سی لگی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو غور سے دیکھا۔ راغب دھیرے سے مسکرا دیا۔ پھر عصمت جواب سنے بغیر ہی چائے کی کیتلی اُٹھائے باورچی خانے میں چلی گئی۔

''بیٹا برا نہ ماننا..... یہ تو سر پھری ہے۔'' خالہ جان نے صفائی پیش کی۔

''نہیں خالہ جان، میں نے بالکل برا نہیں مانا۔'' وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔ ''اچھا اب میں چلوں گا۔''

urdunovelist.blogspot.com

''ذرا ٹھہرو، میں عصمت سے ایک بات معلوم کرلوں۔'' خالہ نے کہا۔ پھر انہوں نے عصمت کو آواز دی۔ ان کی آواز کے جواب میں عصمت فوراً ہی اندر آ گئی۔

''جی، امی۔''

''بیٹا وہ تمہاری ایک دوست ہے نا۔ ارے کیا نام ہے اس کا۔ ہاں شازیہ۔ بیٹا وہ بھی تو اپنا مکان اُٹھانے کو کہہ رہی تھی۔ وہ کیسا رہے گا راغب کیلئے۔''

''مکان نہیں امی۔ صرف ایک کمرہ اُٹھانا چاہ رہی تھی وہ۔''

''اگر انہوں نے ابھی تک نہیں اُٹھایا ہے تو ان سے بات کر لیجئے مجھے ایک کمرہ ہی چاہئے۔ ویسے وہ ہے کس علاقے میں۔'' راغب براہِ راست عصمت سے مخاطب تھا۔

''ہے تو ہمارے ہی علاقے میں، پر اس سے پتا کرنا پڑے گا کہیں اس نے اُٹھا نہ دیا ہو۔'' عصمت نے بتایا۔ ''ان لوگوں کے پاس تین کمرے کا فلیٹ ہے، وہ دونوں اکیلے ہیں، ان کی ضرورت کیلئے دو کمرے کافی ہیں۔ اس لئے وہ ایک کمرہ کسی کو دینا چاہتی تھی لیکن کسی شریف اور شادی شدہ آدمی کو۔''

''پر میں تو شادی شدہ نہیں۔''

''اور شریف؟''

''شریف تو بہرحال میں ہوں۔ اس کی تصدیق کہیں سے بھی ہو سکتی ہے اس وقت بھی میں ایک فیملی کے ساتھ رہتا ہوں، انہیں آج تک مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ پھر میرے بینک سے میرے بارے میں معلوم کیا جا سکتا ہے اور.....''

''اللہ، راغب بھائی آپ تو سیریس ہو گئے۔ میں تو ایسے ہی مذاق کر رہی تھی۔'' وہ ہنسی، پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں آج ہی اس کے گھر جاتی ہوں اگر اس نے کمرہ کسی کو نہیں دیا ہوگا تو وہ آپ کو ہر صورت میں مل جائے گا اور مجھے یقین ہے کہ شازیہ کو آپ سے کوئی شکایت بھی نہیں ہوگی۔''

''جی، شکریہ۔''

''ہاں، بیٹا۔ اس بات کا خیال رکھنا۔ وہ ہمارے اعتماد پر ہی کمرہ دے گی۔'' خالہ جان بہت دیر سے نہیں بولی تھیں اس لئے بولیں۔

''خالہ جان، آپ بالکل فکرمند نہ ہوں۔'' راغب نے یقین دلایا۔ ''اچھا پھر میں چل رہا ہوں۔ شام کو آؤں گا۔ اس عرصے میں آپ بات کر لیجئے گا۔''

راغب باہر نکلا تو اس بار عصمت اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔

راغب کے جاتے ہی شازیہ آ گئی۔ شازیہ کو دیکھ کر عصمت نے نعرہ لگایا۔ ''او کمبخت ذرا پہلے آ گئی ہوتی۔''

''کیوں؟ کیا ہوا؟ کوئی چیز آئی ہوئی تھی تیرے ہاں؟'' شازیہ نے عصمت کے چٹکی لی۔

''اوئی کمبخت۔'' عصمت اس کی چٹکی پر تڑپ گئی۔ ''اب تو باز آ جا۔ شوہر والی ہو گئی تو۔''

''تو کیا ہوا؟ اچھی چیز کا دیکھنا کوئی گناہ تو نہیں۔''

''اچھا، ایک بات سن۔ وہ تو نے اپنے کمرے کا کیا کیا؟''

''کیوں؟''

''تو نے اُٹھایا تو نہیں ابھی۔''

''میں پوچھتی ہوں۔ آخر تجھے تکلیف کیا ہے جو صبح ہی صبح کمرے کا ذکر لے بیٹھی۔''

''مجھے چاہئے وہ کمرہ۔''

''گندے کاموں کیلئے میرا ہی کمرہ رہ گیا ہے؟'' شازیہ نے ہونٹ دبا کر آنکھ ماری۔

''اچھا، زیادہ بکواس نہ کر۔'' عصمت ناراض ہو گئی۔

''کس کے لئے چاہئے تجھے کمرہ۔''

''میرا ایک خالہ زاد بھائی ہے۔ اُس کیلئے۔''

''کیسا ہے؟''

''کنوارا مگر شریف۔''

''ارے جا، مرد کبھی شریف نہیں ہوتا۔ چاہے کنوارا ہو یا شادی شدہ۔''

''ماشاء اللہ، بڑے تجربے ہیں مردوں کے۔''

''ہاں اور کیا۔''

''پر میرے بھائی پر رحم کرنا۔''

urdunovelist.blogspot.com

''چل پگلی! تو نے مجھے ایسی ویسی سمجھا ہے۔ یہ تو میں ایسے ہی ہنس بول لیتی ہوں۔'' شازیہ نے عصمت کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''تیرا بھائی ہے تو یقیناً شریف ہوگا۔ اگر نہیں ہوگا تو اس وقت تک ضرور شریف رہے گا جب تک میں شریف ہوں۔ اپنے بھائی کو جس وقت چاہو سامان کے ساتھ بھیج دو۔ میں نے کمرہ دیا۔''

''اب اتنا جذباتی ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے شوہر سے تو اجازت لے لو۔''

''انہیں کیوں اعتراض ہوگا؟''

''بہت اعتماد کرتے ہیں تجھ پر۔''

''بالکل۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ پھر شام کو میں راغب بھائی کو تیرے گھر بھیج دوں گی تم سے ملاقات ہو جائے گی۔ پھر وہ جب چاہیں گے سامان لے کر پہنچ جائیں گے۔ شام کو تم گھر پر ہی ہوگی نا۔''

''ہاں، میں کہاں جاؤں گی۔'' شازیہ نے بے نیازی سے کہا۔ ''یہ خالہ جان نظر نہیں آ رہی ہیں۔''

اس سے پہلے کہ عصمت کچھ جواب دیتی خالہ جان مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ شازیہ اُن سے بات کرنے میں مصروف ہوگئی اور عصمت نے باورچی خانے کا رُخ کیا۔

☆.....☆.....☆

کلیم نے ابھی پہلا نوالا توڑا ہی تھا کہ گھنٹی بجی۔ نوالا چھوڑ کر وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر کسی اجنبی کو دیکھ کر ایک لمحے کیلئے اس کے چہرے پر حیرت لہرائی۔ پھر اس نے بڑی خوش اخلاقی سے پوچھا۔ ''جی، فرمائیے۔''

''میں عصمت کا بھائی ہوں۔ میرا نام راغب ہے۔'' آنے والے نے تعارف کرایا۔

''عصمت کے بھائی، مسٹر راغب۔'' کلیم نے اندر کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔

''تو پھر اندر بلا لیجئے نا۔ دروازے پر کھڑے کیا کر رہے ہیں۔'' اندر سے آواز آئی۔

''آئیے صاحب، اندر تشریف لائیے۔''

راغب کو دیکھ کر شازیہ احتراماً کھڑی ہوگئی۔ پھر ڈائننگ ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''آئیے پہلے کھانا کھا لیجئے، پھر باتیں کریں گے۔ ویسے آپ تو شام کو آنے والے تھے؟ ان سے

ملئے۔ یہ میرے شوہر ہیں کلیم اور اب مجھ سے ملئے میرا نام ہے شازیہ۔''

''یہ میری بیوی ہیں جناب۔'' کلیم نے مزاحیہ انداز اختیار کیا۔

''یہ بات تو میں نے خود ہی تسلیم کر لی تھی آپ کو اپنا شوہر کہہ کر۔'' شازیہ نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے مردوں کو اپنا حق جتانے کی کچھ زیادہ ہی عادت ہوتی ہے۔ کیوں راغب بھائی ٹھیک کہا نا، میں نے۔''

''جی، بالکل۔'' راغب نے بڑی معصومیت سے اقرار میں گردن ہلائی۔ اُس کی اس معصومیت پر وہ دونوں ہی ہنس پڑے۔

شازیہ نے تین چار منٹ میں تین چار روٹیاں جلد جلد ڈالیں اور پھر تینوں کھانے کیلئے بیٹھ گئے۔ شازیہ کے پُرزور اصرار پر، بے تکلف لوگوں کے ساتھ اُس نے بڑے تکلف سے کھانا کھایا۔ وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔ اجنبی لوگوں کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے اسے ہمیشہ شرم آتی تھی۔ نتیجے میں وہ بھوکا ہی اُٹھ جایا کرتا تھا۔ آج بھی اس کے ساتھ ایسا ہی ہوا، اُس کی فطری شرم نے اسے پیٹ بھر کر کھانے نہ دیا۔

ویسے وہ آج خوش تھا۔ اُسے بہت آسانی سے اچھا مکان مل گیا تھا۔ ایک تو یہ علاقہ بہت اچھا تھا، بڑا بارونق اور دفتر سے قریب۔ دوسرے سواری کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ہر وقت ہر قسم کی سواری دستیاب تھی۔ تیسرے رہائش کے ساتھ کھانے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا۔ ہوٹل بازی نے اس کے پیٹ کا ستیاناس کر دیا تھا۔ پھر دونوں میاں بیوی بڑے نفیس مزاج کے تھے، خوش خلق اور مخلص۔ اس گھر کا ماحول بڑا پُرسکون تھا۔ نہ کوئی شور نہ ہنگامہ۔ اب وہ بہت سکون سے اپنی اسٹڈی جاری رکھ سکتا تھا۔

وہ دوسرے ہی دن مع سامان شازیہ کے گھر شفٹ ہو گیا۔

شازیہ اس کا ہر طرح خیال رکھتی۔ اتنا خیال کہ اس کی ماں اور سگی بہنوں نے بھی نہ رکھا ہوگا۔ ''راغب بھائی، راغب بھائی۔'' کہتے اس کی زبان نہ تھکتی۔ دوسرے کام تو رہے الگ وہ اسے پانی پینے کیلئے بھی نہ اُٹھنے دیتی۔ اتنا پیار دیکھ کر راغب کو خوف آنے لگا کہ کہیں کلیم اس سے نفرت نہ کرنے لگے۔ پر کلیم نے حسد کرنا سیکھا ہی نہ تھا۔ شازیہ کو راغب کا کام کرتے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی میٹھی میٹھی سی۔ اچھی عادات اور اچھے اطوار کے مالک راغب کو اس نے دل

urdunovelist.blogspot.com

سے چھوٹا بھائی تسلیم کرلیا تھا۔ اس کا کوئی چھوٹا بھائی تھا بھی نہیں۔ بھائی ہی کیا، لے دے کے ایک ماموں کے سوا اس دنیا میں اس کا تھا ہی کون؟ اور اب وہ ماموں بھی اس کے نہ رہے تھے کیونکہ کلیم نے ان کی موٹی بھدی لڑکی کو چھوڑ کر اپنی پسند سے شازیہ کو جو اپنا لیا تھا۔ اب شازیہ ہی اس کی اپنی تھی یا یہ شرمیلا سالڑکا جو کئی دن سے اس کے گھر میں آبسا تھا، اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔

راغب کے شفٹ ہونے کے کئی دن بعد عصمت، شازیہ سے ملنے آئی۔ راغب اور کلیم دونوں اپنے اپنے دفتر گئے ہوئے تھے۔ گھر میں شازیہ اکیلی تھی۔

''کیوں ری، میرے بھائی سے تجھے کوئی شکایت تو نہیں۔'' عصمت نے پوچھا۔

''بس ایک ہی شکایت ہے۔ تیرا بھائی شرمیلا بہت ہے۔ اس کو بول، اتنی شرم اچھی نہیں ہوتی۔ کل کلاں شادی ہوگئی اور پلے کوئی اس جیسی شرمیلی بندھ گئی تو دونوں ہی مارے جائیں گے۔''

شادی کے نام پر عصمت کے چہرے پر جانے کیوں شفق سی پھوٹ پڑی۔ اس نے فوراً ہی دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

''اللہ، اللہ۔ ہم ذکر کریں کسی غیر کی شادی کا اور شرم سے چہرہ گلنار ہو آپ کا۔ اس کو کہتے ہیں بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ۔ کیوں ری کیا چکر ہے؟ راغب بھائی خیریت سے تو ہیں۔''

اس دن عصمت، کسی بات کا ٹھیک سے جواب نہ دے پائی اور شازیہ نے اسے چھیڑ چھیڑ کر بیر بہوٹی بنا دیا۔

شازیہ کو شرمیلے لوگ بہت پسند تھے۔ پسندیدگی کی وجہ غالباً یہی تھی کہ اُسے ایسے لوگوں کو چھیڑنے میں خاص لطف آتا تھا۔ کالج کے زمانے میں اس کی تمام سہیلیاں اس کے ہاتھوں تنگ تھیں وہ ہمہ وقت ان کی شرم اُتارنے میں مصروف رہتی۔ ایسی ایسی باتیں کرتی کہ اُن کے چہرے سرخ ہوجاتے۔ کالج کے زمانے کی اب ایک ہی دوست اس کے پاس رہ گئی تھی، اس لئے وہ عصمت کی بیٹری کے سیل کی طرح حفاظت کرتی۔ اسے کم بجاتی، مبادا بیٹری کمزور نہ پڑ جائے۔

اب راغب کے روپ میں ایک شرمیلا کھلونا اور اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اسے پا کر وہ بہت خوش تھی۔ رات کے کھانے کے بعد اکثر ڈائننگ ٹیبل پر ہی محفل جم جاتی۔ وہ تینوں رات گئے تک خوش گپیوں میں مشغول رہتے۔ دنیا بھر کے موضوعات زیر بحث آتے۔ کلیم اور شازیہ میں اکثر ٹھن جایا

کرتی لیکن یہ بحث مباحثے اُن دونوں کے درمیان بدمزگی کا باعث کبھی نہ بنتے۔ وہ دونوں ہی فراخ دل اور خوش مزاج واقع ہوئے تھے۔ شروع شروع میں تو راغب خاموش رہا، ان دونوں کو ہی ایک دوسرے سے اُلجھتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر ذرا جھجک ختم ہونے کے بعد اس نے بھی بولنا شروع کیا۔ راغب کو سیاست اور مذہب سے خاص دلچسپی تھی اور ان موضوعات کو شازیہ اور کلیم بہت کم ہاتھ لگاتے تھے۔ ان دونوں کو ادب اور فنونِ لطیفہ سے زیادہ لگاؤ تھا۔ شازیہ راغب کو خاموش دیکھ کر اکثر اسے بحث میں گھسیٹ لیا کرتی۔

''راغب بھائی! آپ نے عصمت کے افسانے تو پڑھے ہوں گے۔ کچھ اور نہیں تو لحاف ضرور پڑھا ہوگا۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے سوال کرتی۔

''جی نہیں۔''

''کبھی منٹو کا کوئی افسانہ پڑھا۔ ٹھنڈا گوشت وغیرہ۔''

''جی نہیں۔''

''اچھا وہی دھانوی کی کتابیں تو آپ نے ضرور پڑھی ہوں گی کہ وہ بھی نہیں۔'' وہ اُس کی پیشانی عرق آلود کرنے پر اُتر آئی۔

''شازیہ! تو باز نہیں آئے گی۔'' کلیم اسے پیار سے ڈانٹتا۔ ''کیوں تنگ کر رہی ہو، میرے بھائی کو۔''

ایسے سوالوں پر راغب کو واقعی پسینے چھوٹ جاتے۔ وہ بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتا۔

''ہاں، راغب بھائی۔'' وہ اپنے سوالوں کا جواب طلب کرتی۔

''جی میں نے اس مصنف کو بھی نہیں پڑھا۔'' راغب بڑی مشکل سے کہہ پاتا۔

''کمال ہے۔ آپ سے اچھے تو یہ کلیم ہی ہیں۔ انہوں نے ایسی کتابیں نہ صرف پڑھی ہیں بلکہ.....''

''اے، اے۔'' شازیہ جانے کیا انکشاف کرنے لگی تھی کہ کلیم نے میز سے بڑا سا چمچہ اُٹھا کر اسے دکھایا۔ ''تیرے سر پر پڑنے گا اگر آگے کچھ بولی تو۔''

شازیہ نے شرارت سے کلیم کی طرف دیکھا اور پھر ناک سکیڑ کر بولی۔ ''بزدل۔''

urdunovelist.blogspot.com

پھر ایسے ہی ایک رات کھانے کے بعد باتیں بطور "چورن" چل رہی تھیں کہ شازیہ نے راغب سے ایک خطرناک سوال کر ڈالا۔ بات ڈائجسٹ پرچوں سے چلی تھی اور جانے کہاں کہاں گھومتی، غیر ملکی رسائل سے گزرتی، پورنوگرافی کی طرف بڑھ رہی تھی کہ بہت دیر سے خاموش بیٹھے، راغب کو شازیہ نے چونکا دیا۔

"کیوں راغب بھائی، آپ نے پلے بوائے تو دیکھا ہوگا۔" شازیہ نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی جیسے "پلے بوائے" کسی کپڑے کا نام ہو اور وہ اس کی قیمت کے متعلق راغب سے تبادلہ خیال کرنا چاہتی ہو۔

راغب نے واقعی اب تک پلے بوائے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ اس لائن کا آدمی تھا۔ البتہ اس رسالے کے متعلق دوستوں سے خاصا سن رکھا تھا۔ پلے بوائے کا نام سن کر راغب کنپٹی تک سرخ ہوگیا۔ وہ باوجود کوشش کے کوئی جواب نہ دے سکا۔

"اللہ، اللہ۔" شازیہ اس کی شرم سے محظوظ ہوتے ہوئے چہکی۔ "راغب بھائی آپ لڑکی ہوتے تو اچھا ہوتا۔"

"اور آپ کو مرد ہونا چاہئے تھا۔" کلیم کسی قدر خفگی سے بولا۔ "شازیہ آپ کو کیا ہوگیا ہے۔ کیوں اس شریف آدمی کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔"

"راغب بھائی، کیا آپ کو میری بات بری لگی۔"

"جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ دراصل میں بڑا بدذوق واقع ہوا ہوں۔" راغب نے حقیقت پسندی سے کام لیا۔

"دیکھا، راغب بھائی کہیں برا مانے، آپ ویسے ہی شور مچا رہے تھے۔" اس نے کلیم کو چڑایا۔

"ایک شریف آدمی اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہے۔" کلیم اُٹھتے ہوئے بولا۔

کلیم کے اُٹھتے ہی محفل خود بخود برخاست ہوگئی۔ اس رات راغب کو بہت دیر بعد نیند آئی۔

☆.....☆.....☆

آج وہ صبح ہی سے پریشان تھا۔ پتا نہیں وہ واقعی پریشان تھا یا مراد نے ہی ایسا محسوس کیا تھا۔ بہرحال کوئی بات ضرور تھی۔ راغب روز کی طرح نارمل نہ تھا۔ اس سے اب تک کئی غلطیاں سرزد

ہو چکی تھیں۔ بینک کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی آدمی کو مشکل میں ڈالنے والی ہوتی ہے۔

لنچ ٹائم ہوا تو مراد نے حسبِ معمول راغب کو اپنے ساتھ لیا اور کھانے کا آرڈر دے کر راغب سے مخاطب ہوا۔ "ہاں جی، اب بولو کیا بات ہے؟"

"کیسی بات؟" مراد کے اس اچانک سوال پر اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

"آج جو تم سے یہ اُلٹی سیدھی حرکتیں سرزد ہو رہی ہیں۔ میں اس کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔" مراد نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہیں شازیہ نے تم سے وہی وہانوی اسٹائل کا کوئی ناول لکھنے کی فرمائش تو نہیں کر دی۔"

"اس سے بھی زیادہ خطرناک واقعہ پیش آیا ہے میرے ساتھ۔"

"وہ کیا؟"

"کل شام کو جب میں نے تکیہ غلاف بدلنے کے لئے اُٹھایا تو جانتے ہو اس کے نیچے سے کیا نکلا؟"

"وہی وہانوی کا کوئی گرما گرم ناول۔"

"نہیں۔"

"پھر پلے بوائے ہوگا۔"

"وہ بھی نہیں۔"

"پھر اور کیا ہو سکتا ہے؟" مراد نے سر کھجایا۔

"انگیا۔"

"ابے نہیں۔" مراد کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ "حد ہوگئی بھئی۔ لیکن یار، تمہارے کمرے میں، تمہارے تکیے کے نیچے اس کی انگیا کس طرح پہنچ گئی۔"

"اس نے خود اُتار کر رکھی۔"

"کیوں آخر۔"

"بقول اس کے میرے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے اسے چکر سا آگیا۔ وہ فوراً میرے بستر پر لیٹ گئی۔ پھر گرمی زیادہ لگی تو اس نے انگیا نکال دی اور یہ سوچ کر میرے تکیے کے نیچے رکھ دی کہ

urdunovelist.blogspot.com

جاتے ہوئے اُٹھالے گی لیکن وہ ایسا کرنا بھول گئی۔"

"اچھا پھر۔"

"پھر یہ کہ میری شکل دیکھ کر اچانک اسے اپنی گم شدہ انگیا یاد آئی جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوئی تو اس وقت انگیا میرے ہاتھ میں تھی۔ میں اسے بڑے شوق سے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ شازیہ کو دیکھتے ہی مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی۔ میرے کانپتے ہاتھوں میں لرزتی انگیا کو وہ چند لمحے بڑے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر بغیر کچھ کہے اس نے انگیا میرے ہاتھوں سے لے لی اور مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ پھر چائے پیتے ہوئے اس نے ساری تفصیل بتائی اور اپنی بھول کی سو طرح سے معذرت کی۔ خدا کی قسم بڑی عجیب لڑکی ہے۔"

"گھر میں اس کا شوہر نہیں تھا۔"

"نہیں، کلیم نے آج کل ایک پارٹ ٹائم سروس کر لی ہے۔ اب وہ رات کے آٹھ بجے گھر لوٹتا ہے ویسے وہ گھر میں ہوتا بھی تو کیا۔ کون سا وہ اس سے شرماتی ہے۔ اپنے شوہر کے سامنے تو وہ کچھ زیادہ ہی فری ہو جاتی ہے۔"

"یار، تم اسے پکڑ کیوں نہیں لیتے۔ آخر کب تک شریف بنے رہو گے؟"

"نہیں یار، ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا..... آدمی جب خود سر سے کفن باندھے گھوم رہا ہے تمہارے ہاتھوں ہلاک ہونے کیلئے بے چین ہے تو اپنی بندوق کی نال اس کے سینے پر کیوں نہیں رکھ دیتے اب انتظار کیوں؟" مراد خفا ہو گیا۔ "دیکھو یار ڈھکو سلے بازی چھوڑو۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ بے باک لڑکیاں کرپٹ نہیں ہوتیں، میری مانو وہ لڑکی سو فیصد کرپٹ ہے اور تمہارے ہاتھوں مزید کرپٹ ہونا چاہتی ہے۔ دیکھو عورت زیادہ انتظار نہیں کرتی۔ اور نہ ہی زبان سے اپنی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مایوس ہو کر تمہیں انتقاماً گھر سے نکال دے اس پر فائر کر دو۔ اسے اپنا بنا لو۔"

"بات صرف وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو۔" راغب نے ٹھنڈے پانی کے کئی گھونٹ لئے۔ پھر ہونٹوں کے کناروں سے پانی صاف کرتا ہوا بولا۔ "میں نے اپنے شریف ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔ نہ میں شریف ہوں اور نہ ہی اتنا کم عقل کہ کسی کے اشاروں کو نہ سمجھ سکوں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں سب کچھ

جانتے ہوئے بھی کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"کیوں؟" مراد نے مولی دانت سے کاٹی۔

"یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ شازیہ، عصمت کی عزیز ترین سہیلی ہے، میری خالہ زاد بہن ہے۔ اسی کی وجہ سے یہ کمرہ مجھے ملا۔ اخلاقی طور پر یہاں شرافت سے رہنے کا پابند ہوں۔ پھر، آج تمہیں ایک بات اور بتاتا ہوں۔ میں ذاتی طور پر عصمت کو پسند کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنے کا خواہش مند ہوں۔ عصمت بھی مجھے پسند کرتی ہے۔ عصمت کی رضامندی دیکھ کر میں نے اپنی امی کو صاف صاف لکھ دیا تھا اور ان سے عصمت کا رشتہ مانگنے کی درخواست بھی کی۔ امی نے میری خواہش کے مطابق فوراً ہی خالہ جان کو خط لکھ دیا۔ اب یہ لوگ رشتے کے سلسلے میں غور کر رہے ہیں۔ اس مرحلے پر اگر میں تمہاری خواہش کے مطابق شازیہ کو دبوچ لیتا ہوں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں شازیہ کے ساتھ ہی عصمت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھوں اور اتنی اچھی رہائش بھی میرے ہاتھ سے نکل جائے۔"

"وہ کیسے؟"

"بھئی اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ شازیہ یہ حرکتیں دل سے کر رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ممکن ہے شازیہ نے یہ جال عصمت کے کہنے پر پھیلایا ہو۔ میرا کردار پرکھنے کیلئے۔ پھر میں رسک کس طرح لے سکتا ہوں۔" راغب ہاتھ دھونے کے لئے اُٹھا۔

"ٹھیک ہے، پھر شریف بنے رہنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔" مراد اس کے ساتھ چلتا ہوا بولا۔ "ویسے یار اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کب کا شازیہ کو پکڑ چکا ہوتا۔ چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلتا۔ مٹھائی سجے سجائے تھال میں پیش ہو اور کھانے کے لئے ہاتھ نہ اُٹھے۔ یہ اپنے بس کا نہیں۔ تمہارے جیسا صبر کوئی کہاں سے لائے۔"

"اب تم نے صبر کی بات کی ہے تو ایک واقعہ اور سن لو۔" راغب کے لہجے میں فخر تھا۔ اسے اپنی پارسائی دکھانے کا ایک موقع اور ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ دھو کر پھر اپنی جگہ آ بیٹھے اور چائے کا انتظار کرنے لگے۔

"اچھا جی، شروع ہو جاؤ۔" مراد نے سگریٹ سلگایا۔

urdunovelist.blogspot.com

"یہ بات آٹھ دس دن پہلے کی ہے۔ اس دن میں سمجھا تھا کہ ایسا اتفاقاً ہو گیا ہے لیکن اب مجھے یقین ہے کہ یہ سب اس کی سوچی سمجھی اسکیم تھی۔"

"پر ہوا کیا؟"

"ایک دن شام کو جب میں گھر پہنچا تو خلاف توقع دروازہ اندر سے بند ملا۔ میں نے گھنٹی بجائی اور دروازہ کھلنے کا انتظار کیا۔ دروازہ نہ کھلنے پر دوبارہ گھنٹی بجائی۔ دروازہ پھر بھی نہ کھلا۔ مجھے اُلجھن ہونے لگی۔ میں نے دروازے سے کان لگا کر آہٹ لینے کی کوشش کی۔ اندر گہرا سناٹا تھا۔ میں نے ایک بار دیر تک گھنٹی بجائی اور پھر چابی کے سوراخ سے اندر جھانک کر دیکھا۔ مجھے اپنے کمرے کے دروازے کے سوا کچھ نظر نہ آیا جو حسب معمول بند تھا۔ اس مرتبہ میں نے گھنٹی کے بجائے دروازے پر ہاتھ سے دستک دی تب ہی اندر سے کوئی آواز آئی۔ میں نے فوراً چابی کے سوراخ سے اندر جھانک کر دیکھا۔ شازیہ دروازے کی طرف آ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میرے ذہن میں غبارے سے پھٹنے لگے۔ میں فوراً ہی سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

"کون ہے؟" اندر سے شازیہ کی آواز آئی۔

"میں، راغب!" میں نے بہ مشکل تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"اچھا میں دروازہ کھول رہی ہوں لیکن اس وقت تک اندر نہ آیئے گا جب تک میں آواز نہ دوں۔"

"اندر سے چٹخنی گرنے کی آواز آئی اور میں باوجود شدید خواہش کے چابی کے سوراخ سے اسے جاتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ تم چاہے اسے کم ہمتی کہہ لو یا شرم۔ خیر جب اس کی اندر سے آواز آئی "آ جایئے" تو میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس وقت تک باتھ روم کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور جلد جلد پانی گرنے کی آوازیں آنی شروع ہو گئی تھیں۔"

"یار میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔"

"بھئی وہ نہاتے سے اُٹھ کر دروازہ کھولنے آئی تھی۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ صابن لگا ہوا تھا۔ اب تم خود ہی سمجھ لو یا مزید تشریح کروں؟"

"بس، بس کافی ہے۔ ننگی کو ننگی کہنے سے کیا فائدہ۔" مراد ہنسا۔ پھر سگریٹ کا کش لیتے ہوئے

بولا۔ "ہائے ہائے۔ اس کی باتیں سنا سنا کر تم نے مجھے تباہ کر دیا۔ اب تو اس سے میری ملاقات کرا ہی دو۔"

"تم صرف باتیں سن کر ہی تباہ ہو گئے۔ پھر میرا کیا حال ہوتا ہو گا۔ یہ ذرا سوچو۔"

"یار تم انتہائی بدقسمت اور انتہائی خوش قسمت آدمی ہو۔"

"شاید، تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔" راغب نے چائے کی پیالی پر نظریں جما دیں۔

☆.....☆.....☆

شازیہ نے ناول میز پر پھینک کر ایک زوردار انگڑائی لی اور پھر جسم ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں موند لیں۔ ابھی اس پر غنودگی طاری ہوئی تھی کہ گھنٹی کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ گردن جھٹک کر اُٹھی۔ اس بھری دوپہر میں کون آ ٹپکا۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے دروازہ کھولا۔

"آداب عرض۔" عصمت نے مسکراتے ہوئے اسے آنکھ ماری۔ "بیگم صاحبہ سو رہی تھیں شاید۔"

"یہ تیرے آنے کا وقت ہے۔" شازیہ نے ڈانٹ پلائی۔

"کسی اور کو آنے کا وقت دے رکھا تھا کیا؟" عصمت نے چھری چلائی۔

"بس اب چپ ہو جا ورنہ میرے منہ سے کچھ سن لے گی۔" شازیہ نے پلٹ کر دروازہ بند کیا۔ پھر بولی۔ "ذرا آئینے میں اپنی شکل تو دیکھ، چوٹی سے ایڑی تک پسینے میں بھیگی ہوئی ہے جیسے نہا کر نکلی ہو۔ ویسے ایمان سے لگ بڑی پیاری رہی ہے۔ ہائے پسینے میں بھیگا حسن۔"

"بس ہو گئی شروع۔ اللہ کی نیک بندی کبھی کوئی اور بات بھی کیا کر۔"

"اور باتوں کے لئے تو جو ہے۔"

"اچھا ایک بات سن۔" عصمت نے پنکھے کے نیچے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لاہور والی خالہ نے مجھے مانگا ہے۔"

"نقد یا ادھار۔"

"بکواس نہ کر۔"

"اچھا کس کے لئے۔"

"جو تیرے گھر میں رہتا ہے، اس کے لئے۔" عصمت نے جواب دیا۔

urdunovelist.blogspot.com

''کلیم کے لئے؟ تیری خالہ کو پتا نہیں کہ وہ شادی شدہ ہے۔''

''کم بخت کچھ شرم کر۔''

''وہ تو ساری تیرے پاس ہے، اچھا اسے چھوڑ، یہ بتا تیرے گھر والوں نے کیا جواب دیا۔''

''ابھی تو کوئی جواب نہیں گیا ہے۔ مشورے ہو رہے ہیں۔ ادھر ماموں جان لندن سے آنے والے ہیں۔ ان کا بھی انتظار ہے پھر شاید کچھ طے ہو جائے۔''

''تو نے اپنے طور پر کیا طے کیا۔''

''تو بتا۔'' عصمت کرسی سے اُٹھ کر بیڈ پر آ گئی۔ ''وہ تیرے پاس کئی مہینے سے رہ رہا ہے تو اس کے مزاج سے زیادہ واقف ہو گی۔''

''میری رائے میں تو راغب ہیرا ہے۔'' شازیہ نے کہا۔

''پتھر تو میں بھی نہیں سمجھتی، پر کچھ بتا تو اس کے بارے میں۔''

''مردوں کے بارے میں، ہمیشہ سے میری رائے رہی ہے کہ یہ قوم جنگلی بھینسے کی طرح ہوتی ہے۔ جہاں ہری بھری کھیتی دیکھی، لپکے اور اسے اجاڑ دیا لیکن راغب نے یہ ثابت کیا کہ وہ جنگلی بھینسا نہیں خوبصورت ہرن ہے۔''

''کیا تو نے اسے آزمایا تھا؟'' عصمت اس کے اور قریب ہو گئی۔

''نہیں، قصداً تو میں نے ایسا نہیں کیا، بس خود بخود ہی اس کی آزمائش ہو گئی۔'' یہ کہہ کر شازیہ نے انگیا والا واقعہ تفصیل سے سنایا۔

پھر اس نے وہ تمام باتیں بھی ایک ایک کر کے بتا دیں جو وہ اسے چھیڑنے کی خاطر کرتی رہی تھی۔ اس دن کا بھی ذکر کیا جب اسے نہاتے سے اُٹھ کر دروازہ کھولنا پڑا تھا۔ عصمت نے تمام باتیں بڑی دلچسپی سے سنیں۔ کرید کرید کر ہر بات کی بال کی کھال نکالی۔ راغب کے رویے کی بار بار تصدیق چاہی اور پھر جانے کیوں اس کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی اور وہ بغیر کچھ کہے، خاموشی سے اپنے گھر چلی گئی۔ شازیہ کوشش کے باوجود اس اچانک تبدیلی کی وجہ نہ جان سکی۔

دو تین دن تک تو اس نے عصمت کا انتظار کیا جب وہ نہ آئی تو اس کی الجھن بڑھی۔ آخر ایک دن وہ خود ہی اس کے گھر پہنچ گئی۔ عصمت دیکھتے ہی اس کی طرف لپکی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے

گھسیٹتی ہوئی اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ اسے بستر پر دھکا دے کر دروازہ اندر سے بولٹ کر لیا اور کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

''کمر پر ہاتھ رکھے تو اس طرح کھڑی ہے جیسے میری عصمت لوٹنے کا ارادہ ہو۔'' شازیہ کی شریر زبان نے پٹاخہ چھوڑا۔

''ہائے کمبخت۔'' عصمت کھڑے کھڑے بیڈ پر گر گئی اور اسے کھسیا کر نوچنے لگی۔

''اچھا، شرمیلی بیگم مجھے یہ تو بتاؤ کہ اس دن تمہیں کیا ہو گیا تھا۔'' شازیہ نے اس کی گرفت سے نکلتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف یہی پوچھنے آئی تھی۔''

''سن تجھے ایک بات بتاؤں۔'' عصمت اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''جس دن میں تیرے ہاں سے واپس آئی، اسی شام امی نے مجھ سے راغب کے بارے میں رائے معلوم کی تھی، جانتی ہے میں نے کیا کہا۔''

''تو نے کیا کہا ہو گا۔ بس سن کر شرما گئی ہو گی یا زیادہ سے زیادہ کہہ دیا ہو گا، امی جیسی آپ کی مرضی۔'' شازیہ نے شرمانے کی اداکاری کی۔

''نہیں، میں نے صاف طور پر امی سے کہہ دیا کہ راغب مجھے پسند نہیں۔'' عصمت نے انکشاف کیا۔

''کیا؟'' شازیہ اس طرح چونکی جیسے اس کی شلوار میں چوہا گھس گیا ہو۔ ''آخر اس میں کیا خرابی ہے؟''

''وہ فرشتہ ہے!'' خامی بیان کی گئی۔

''یہ خامی ہے یا خوبی۔'' شازیہ حیرت زدہ تھی۔

''میرے نزدیک خامی ہے۔ تیری زبانی تمام باتیں سن کر میں نے اندازہ لگایا کہ آدھے مکان میں رہنے والا لڑکا خود بھی اندر سے آدھا مکان ہے۔'' عصمت چند لمحوں کے لئے رکی۔ پھر گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''اور آدھے مکان کے ساتھ ایک عورت کی زندگی کس طرح بسر ہو سکتی ہے تو خود ہی سوچ۔''

یہ سن کر شازیہ سناٹے میں آ گئی۔ بہت دیر تک گم صم بیٹھی رہی۔

urdunovelist.blogspot.com

☆.....☆.....☆

شام کو جب راغب بینک سے واپس آ کر فوراً ہی کہیں جانے کی تیاری کرنے لگا تو شازیہ دھیرے سے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ راغب جھکا ہوا جوتے کے بند باندھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ''آیئے۔''

''کہاں جا رہے ہیں آپ؟'' شازیہ نے پوچھا۔

''جی عصمت کے گھر۔'' راغب نے ذرا جھینپتے ہوئے کہا۔

''عصمت سے آپ کی شادی نہیں ہو سکے گی وہاں مت جایئے۔'' ایک شعلہ سا لپکا۔

''جی!'' وہ لڑکھڑا گیا۔ ''لیکن کیوں؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' شازیہ کے لہجے میں بے آواز چیخیں تھیں۔ ''اب آپ اپنے لئے نیا مکان تلاش کر لیجئے لیکن خدا کیلئے آدھا مکان ہرگز نہ لیجئے گا۔''

پھر شازیہ ایک لمحے کے لئے بھی وہاں نہ ٹھہری۔ وہ دوپٹے سے اپنی بھیگی آنکھیں صاف کرتی، کمرے سے تیزی سے نکل گئی۔ راغب کچھ نہ سمجھ سکا، کچھ نہ کہہ سکا۔ □□

کچھ ہے

یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ لڑکی اپنا چھوٹا سا خوبصورت بیگ لائبریرین مظفر کی میز پر بھول گئی تھی، اور یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ اس شریف آدمی نے اس بیگ کو کھول کر دیکھ لیا تھا۔

اور بیگ کھولتے ہی جو چیز پھسل کر سب سے پہلے میز پر گری، اسے دیکھتے ہی اس شریف آدمی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے اس چیز کو چٹکی سے پکڑا اور بیگ میں ڈال کر جلدی سے بیگ کو بند کر دیا اور اُس کو اسی طرح رکھ دیا جیسے لڑکی چھوڑ کر گئی تھی۔

ہینڈ بیگ میں پچیس تیس روپوں، ایک بال پین، ایک پینسل اور دو لائبریری کارڈز کے علاوہ کچھ نہ تھا..... لیکن وہ عجیب و غریب چیز بھی تو اسی ہینڈ بیگ سے پھسل کر میز پر گری تھی جسے دیکھ کر وہ خوفزدہ سا ہو گیا تھا..... بیگ سے پھسل کر گرنے والی چیز کسی انسانی ہاتھ کی کٹی ہوئی خون آلود انگلی تھی نہ ہی کوئی پھدکتی ہوئی چوہیا اور نہ ہی بالشت بھر کا کوئی آدمی تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے بڑھنا شروع کر دے..... وہ ان سے بھی زیادہ کپکپا دینے والی چیز تھی۔

لائبریرین مظفر ابھی اس لڑکی کے ہینڈ بیگ کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ لڑکی گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس لڑکی نے دیکھا کہ لائبریرین مظفر اپنے کام میں مصروف ہے اور بیگ جوں کا توں میز پر رکھا ہے، تو اسے کچھ سکون سا ملا، اور وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولی.....

urdunovelist.blogspot.com

''معاف کیجئے گا سر..... میرا بیگ یہاں رہ گیا تھا۔''

اس شریف آدمی نے گردن اُٹھائی، پہلے لڑکی کو اور پھر میز پر رکھے ہوئے بیگ کو دیکھا، تو اس کے چہرے پر مصنوعی حیرت کی لکیر نمایاں ہوگئی.....

''ارے، یہ تو میں نے دیکھا ہی نہیں..... اچھا ہوا آپ فوراً ہی واپس آ گئیں، ورنہ مجھے آپ کی تلاش میں چپراسی بھیجنا پڑتا۔''

لڑکی نے جھپٹ کر بیگ اپنے قبضے میں کیا۔ ہونٹوں سے شکریے کا لفظ ادا کیا، اور تیز تیز لیکن پُرسکون انداز میں کمرے سے نکل گئی۔ مظفر کے رویے سے لڑکی کو یقین ہوگیا تھا کہ اس کے بیگ میں رکھی ہوئی چیز پر مظفر کی نظر نہیں پڑی تھی۔

وہ لڑکی نفسیات کے کسی موضوع پر ریسرچ کر رہی تھی اور ایک ایسی قیمتی اور کمیاب کتاب لائبریری سے گھر لے جانا چاہتی تھی جس کی صرف ایک جلد لائبریری میں موجود تھی اور اس کتاب کو ایشو کروانے کے لئے لائبریرین کی خصوصی اجازت ضروری تھی اور مظفر جیسے بااصول آدمی سے اس بات کی ہرگز امید نہ تھی کہ وہ ایسی نادر کتاب کو گھر لے جانے کی اجازت دیدے گا۔ اور اتفاق سے جب اس شریف آدمی نے لڑکی کی شدید ضرورت کے تحت کتاب ایشو کروانے کی اجازت دے دی تو وہ لڑکی عجلت میں کاؤنٹر کی طرف بھاگی کہ کہیں مظفر اپنا فیصلہ نہ بدل دے۔ اور اسی عجلت میں وہ اپنا ہینڈ بیگ میز پر بھول گئی۔

لڑکی کے جاتے ہی مظفر نے دل ہی دل میں ایک زوردار قہقہہ لگایا اور گھنٹی بجا کر چپراسی سے چائے لانے کو کہا۔ چپراسی چائے کی پیالی اس کی میز پر رکھ گیا تو وہ کچھ سوچتے ہوئے پیالی میں چمچہ گھمانے لگا۔ چمچے کے ساتھ چائے گھوم رہی تھی اور پیالی کے درمیان ایک چھوٹا سا بھنور بن گیا تھا۔

مظفر نے اس چھوٹے سے بھنور پر نظریں جما دیں۔

یہ کئی سال پہلے کی بات ہے، شاید آٹھ دس سال پہلے کی۔ ان دنوں مظفر ایم اے کر رہا تھا۔ اپنی ذہانت اور وسیع مطالعے کی وجہ سے ہر استاد کا چہیتا تھا۔ اور اپنی نیک نفسی، ملنساری اور شرافت کی بناء پر کلاس کی ہر لڑکی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور دوستی گانٹھنا چاہتی تھی لیکن یہ مظفر کی اپنی بدنصیبی تھی کہ ذہین ہونے کے باوجود لڑکیوں کے بارے میں اس کا مطالعہ صفر تھا اور اس کے بدھو پن سے

تنگ آ کر بعض لڑکیوں نے طنزاً اسے ''بھیا'' کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ پھر بھی نہ چونکا اور لڑکیوں کے بجائے نصاب کی کتابیں گھول گھول کر پیتا رہا۔

اس کا ایک بہت اچھا دوست نصیر اکثر اس سے لڑکیوں کی باتیں کرتا۔ دن بھر کی رپورٹ سناتا، کہ فلاں لڑکی سے یوں بات ہوئی، فلاں نے یوں کہا، آج فلانی کے ساتھ چائے پی تو ڈھاکی نے یوں ہنس ہنس کر بجلیاں گرائیں۔ پھر تبصرے ہوتے فلانی کی ناک موٹی ہے، کسی کے کان چھوٹے ہیں، فلاں اپنے بالوں میں پولی کلر لگاتی ہے۔ فلاں پیچھے سے اچھی دکھائی دیتی ہے تو کوئی آگے سے بھلی معلوم ہوتی ہے..... اور وہ کتاب کے درمیان انگلی رکھے بڑے صبر سے نصیر کی باتیں سنتا رہتا اور جب نصیر بولتے بولتے تھک جاتا تو وہ اس سے پوچھتا۔

''بس، یا اور کچھ کہنا ہے؟''

''تم بہت سور ہو۔'' نصیر چڑ جاتا اور لپک کر اس کی گردن پکڑ لیتا۔ پھر کہتا..... ''بیٹا تم یہ نقاب اتارو اور سیدھے راستے پر آ جاؤ!''

مظفر جواب میں بھولپن سے مسکرا دیتا، اور یہ مسکراہٹ خالص سونے جیسی ہوتی۔

نصیر کئی دن سے محسوس کر رہا تھا کہ نینی کی قمیص دن بدن تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ یہ بات بھی اسے اچھی طرح معلوم تھی کہ عورت جب کسی مرد کو شکار کرنا چاہتی ہے تو سب سے پہلے اسے اپنے ابھاروں کے نشانے پر رکھ لیتی ہے اور اس دودھاری وار سے شاذ ہی کوئی مرد بچ پاتا ہے۔

سانولی سلونی نینی نے کلاس کے کس لڑکے پر جال پھینکا ہے، اگرچہ اس کا پتہ لگانا آسان نہ تھا لیکن نصیر کی تیز نظروں نے اتنا ضرور اندازہ لگا لیا تھا کہ اس طوفان کا رخ کس طرف ہو سکتا ہے۔

پھر ایک شام کینٹین جاتے ہوئے اس نے مظفر کو پکڑ لیا۔

''یہ آج کل ساون بھادوں کی سانولی سلونی بدلیاں تمہارے گرد کیوں منڈلا رہی ہیں؟'' نصیر نے بات چھیڑی۔

''میں شاعرانہ زبان ذرا کم سمجھتا ہوں، آپ آدمیوں کی طرح بات کریں۔''

''نینی کو جانتے ہو؟''

''ہاں، اچھی طرح!..... اس لئے کہ وہ ہم دونوں کی کلاس فیلو ہے۔''

urdunovelist.blogspot.com

''صرف کلاس فیلو؟..... میں نے سنا ہے وہ تم میں دلچسپی لے رہی ہے۔''

''سنی سنائی باتوں پر اتنی جلدی یقین نہ کیا کرو بیٹے!'' مظفر نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

''میں اگر کہوں کہ میں نے خود ایسا محسوس کیا ہے تو؟''

''تو میں تم سے اس کا ثبوت مانگوں گا۔''

''میں دیکھ رہا ہوں کہ نینی آج کل تمہیں خاصی لفٹ دے رہی ہے۔ نینی کو دوسرے لڑکوں سے جن میں، میں بھی شامل ہوں اتنی بے تکلفی سے بات کرتے آج تک نہیں دیکھا گیا جتنی وہ تم سے کرتی ہے۔ ہر وقت تمہارے قریب رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ کلاس میں ایسی جگہ بیٹھتی ہے جہاں تم سے آنکھیں چار ہوتی رہیں۔ تم سے بات کرتے وقت بات بات پر ہنستی ہے، بلکہ ہنستی زیادہ ہے بات کم کرتی ہے۔'' نصیر اتنا کہہ کر ایک لمحے کو رکا، تو مظفر نے ٹوکا۔

''بس یا اور.....؟''

''میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ باتیں کرتے وقت نینی کا دوپٹہ بار بار اس کے سینے سے ڈھلک جاتا ہے۔ پھر کبھی کبھی وہ تمہارے سامنے اتنی جھک جاتی ہے کہ میرا خیال ہے کہ تم بڑی حد تک بہت کچھ دیکھ لیتے ہو گے۔''

''اور آگے.....؟''

''اور آگے یہ کہ تم دونوں لائبریری میں گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے دیکھے گئے ہو اور تم نے کینٹین جا کر اس کے ساتھ چائے بھی پی..... میرا خیال ہے کہ یہ ساری باتیں تمہاری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں اور میرا نیک مشورہ یہ ہے کہ کنواں خود پیاسے کے پاس آئے تو پیاس بجھا لینی چاہئے۔ زیادہ برہم چاری بننے کی ضرورت نہیں۔''

''نصیر بیٹے تمہارے نام نہاد نیک مشورے اور اس ساری بکواس کا بے حد شکریہ..... اصل بات یہ ہے کہ کتاب کا ایک باب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، مجھ سے ڈسکس کرنا چاہتی تھی، مجھے جو کچھ آتا تھا وہ میں نے اُسے بتا دیا۔ بحث و مباحثے سے جب ہم دونوں بور ہو گئے تو چائے پینے چلے گئے۔ بس اتنی سی بات تھی جس کا تم نے افسانہ بنا دیا..... تم اس کے سینے کی بات کرتے ہوئے میں نے آج

تک اس کا چہرہ بھی غور سے نہیں دیکھا۔ ہنس کر بات کرنے کی اُسے عادت ہے۔ اچھے گھرانے کی لڑکی ہے اس لئے سوشل ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ہر لڑکے سے اسی طرح بات کرتی ہے۔ اب آپ اپنی غلط فہمی دور کر لیں اور بتائیں کہ کتنے کریم رول کھائیں گے؟'' مظفر نے اس کی ران پر چٹکی لی۔

نصیر بلبلا کر رہ گیا۔

اُدھر جب نینی نے دیکھا کہ محبت کے معاملہ میں مظفر چغد ثابت ہو رہا ہے اور اس کی ترچھی نظروں کے بان، من موہنی مسکراہٹ اور اُبھاروں کے طوفان سب ضائع ہو رہے ہیں تو اس نے دوسرا چکر چلایا۔ اس نے لائبریری سے کتاب ایشو کروانے کے بہانے مظفر سے کارڈ مانگا، اور پھر پورے ایک ہفتے اپنے پاس رکھ کر اسے واپس کر دیا اور اس لائبریری کارڈ کے اندر جو چھوٹے سے لفافے کی طرح کا تھا ایک پرچہ رکھ دیا۔ پرچے میں کارڈ دینے کے سلسلے میں شکریہ ادا کیا گیا تھا اور آخر میں لکھا تھا کہ آپ آئندہ بھی ضرورت کے وقت کام آتے رہیں گے۔

مظفر لائبریری کارڈ میں پرچہ رکھا ہوا دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور جب اس نے پرچہ پڑھا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر یہ کیوں لکھا گیا ہے۔ اوّل تو ضرورت کے وقت کسی کو کارڈ دینا اتنا بڑا کام نہیں کہ اس کی واپسی کے وقت شکریہ ادا کیا جائے اور اگر شکریہ ادا کرنا ہی تھا تو نینی زبانی بھی کہہ سکتی تھی، اس تحریری شکریے کی آخر کیا ضرورت تھی..... پھر یہ جملہ بھی بڑا معنی خیز ہے کہ آپ آئندہ بھی ضرورت کے وقت کام آتے رہیں گے۔

''لو مولانا یہ پرچہ پڑھو اور فتویٰ دو!''..... آخر مسئلہ نصیر کے سامنے پیش کیا گیا۔

نصیر نے بڑے سکون سے کئی بار پرچہ پڑھا اور پھر تڑ سے مظفر کو آنکھ ماری۔

''یہ آنکھیں وانکھیں بعد میں مارتے رہنا، پہلے یہ بتاؤ کہ یہ کیا سلسلہ ہے؟''

''ابے سلسلہ!..... یہ تو محبت نامہ ہے محبت نامہ!''

''آخر یہ ہے کس زبان میں، اپنے پلے تو کچھ نہیں پڑا۔''

''تمہارے پلے تو اس وقت بھی کچھ نہیں پڑا تھا جب ہم نے کہا تھا کہ نینی تم میں دلچسپی لے رہی ہے، اور آج ہم پھر کہتے ہیں کہ یہ کوئی معمولی پرچہ نہیں، باوقار محبت نامہ ہے۔ اب وہ کوئی مڈل پاس لونڈیا تو ہے نہیں جو دس بارہ بے وزن عشقیہ اشعار لکھنے کے بعد اپنی راتوں کی نیند حرام ہونے کا

urdunovelist.blogspot.com

تذکرہ فرمائے اور خط پر دو چار پانی کی بوندیں ٹپکا کر انہیں آنسو بتائے ..... بھائی ایم اے کی لڑکی ہے، اس کا اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ آپ آئندہ بھی ضرورت کے وقت کام آتے رہیں گے ..... ایمان سے یہ جملہ ہزار محبت ناموں پر بھاری ہے۔ ہائے کتنی اپنائیت ہے اس میں!''

''پھر اب کیا کرنا چاہئے؟''..... نصیر کی باتوں سے وہ خاصا متاثر ہوا۔

''ابے کرنا کیا ہے..... محبت کا جواب محبت ہی ہو سکتا ہے!''

''اس کا مطلب ہے کہ میں بھی اسی طرح کا سوانگ بھروں۔ پہلے اس سے کارڈ مانگوں۔ پھر اس کارڈ میں پرچہ رکھ دوں۔ لیکن اس میں لکھا کیا جائے گا؟''..... مظفر کے چہرے پر سوالیہ نشان لہرایا۔

''تم بھی شکریہ ادا کرو..... اور آخر میں لکھ دو کہ دونوں کی ضرورتیں یکساں ہیں اس لئے دونوں کو ایک دوسرے کے کام آنے کا عہد کر لینا چاہئے!''

''اور اس کے جواب میں اگر میرے سر پر جوتے پڑ گئے تو.....؟''

''کچھ نہیں ہوگا، قطعی مطمئن رہو..... ہاں البتہ تمہیں اپنے چہرے سے بزدلی کی نقاب اُتارنی پڑے گی۔''

بزدلی کی نقاب نوچ پھینکنا مظفر جیسے ڈھیلے آدمی کے بس کا روگ نہ تھا۔ لیکن نصیر کے بار بار اُکسانے اور لعن طعن کرنے کی وجہ سے مظفر وہ کر گزرا جو شاید اس سے خواب میں بھی نہ ہو پاتا۔

نصیر نے اسے پٹری پر چڑھا کر ایسا دھکا مار دیا تھا کہ وہ اب بغیر کسی سہارے کے محبت کی راہ میں سرپٹ دوڑا جا رہا تھا۔

نینی بہت خوش تھی، اور خوش کیوں نہ ہوتی۔ کلاس کا سب سے ذہین اور اسمارٹ لڑکا اس کے قابو میں آ گیا تھا اور اپنی اس فتح پر وہ اتراتی پھرتی تھی۔ کلاس کی دوسری لڑکیاں اندر ہی اندر اُسے دیکھ کر کڑھنے لگی تھیں، لیکن نینی کو کسی کی پروا نہ تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جب وہ ایم اے کر کے گھر جائے گی تو ایم اے کی ڈگری کے ساتھ ایک عدد شوہر بھی اس کے ساتھ ہوگا۔ اور یہ بات ہر لڑکی کے لئے قابل فخر تھی۔

اب نینی اور مظفر کی دوستی، اکٹھا رہنے، لائبریری میں گھنٹوں بیٹھنے، کینٹین میں چائے پینے اور خوش گپیاں کرنے، شام کو ادھر ادھر ٹہلنے اور نینی کے ہوسٹل کے چکر کاٹنے سے نکل کر پکچر دیکھنے تک جا

پہنچی تھی۔

اس دن مظفر کامیڈی فلم سے بڑا محظوظ ہو رہا تھا۔ بار بار قہقہے لگا رہا تھا، لیکن نینی اپنی سیٹ پر بیٹھی بار بار کسمسا رہی تھی۔ اسے یہ پتہ ہوتا کہ مظفر اسے چھوڑ کر فلم میں اتنا محو ہو جائے گا تو وہ ہرگز فلم دیکھنے کی ضد نہ کرتی۔ اس کے سفید نرم ملائم مخروطی ہاتھ اندھیرے میں پانی میں پڑے ہوئے سیپ کی طرح چمک رہے تھے، لیکن ان سیپوں کو چھونے والا کوئی نہ تھا۔ آخر نینی سے رہا نہ گیا۔ اس نے مظفر سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''بڑا مزہ لے رہے ہیں آپ!''

''تم بھی لو، تم کیوں رو رہی ہو!'' مظفر بڑے موڈ میں تھا۔

''مجھے سردی لگ رہی ہے، میرے تو ہاتھ بھی ٹھنڈے ہو گئے۔''

''ہاتھوں کو ایک دوسرے پر رگڑو، ابھی گرم ہو جائیں گے۔'' مظفر نے مشورہ دیا۔

''بدھو.....'' نینی کی وجود چیخ اُٹھا۔ لیکن مظفر تک آواز نہ پہنچی۔ وہ حسب معمول قہقہے لگاتا رہا۔

نینی نے بور ہو کر سیٹ کے ہتھے کو مضبوطی سے پکڑ لیا، اور پیچھے کھسک کر نیم دراز ہو گئی۔ ادھر کامیڈین کی کسی حرکت پر مظفر نے زوردار قہقہہ لگایا اور بے خیالی میں اپنا ہاتھ سیٹ کے ہتھے پر مارا۔ نینی بلبلا کر رہ گئی۔ مظفر کو اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نینی کا ہاتھ چھوا۔ اپنی اس بے ڈھنگی حرکت کی معافی مانگی اور اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''چوٹ زیادہ تو نہیں لگی؟''

''چوٹ تو بہت زور سے لگی تھی، لیکن.....'' نینی نے قصداً جملہ ادھورا چھوڑ دیا، اور مظفر کا ہاتھ بڑے پیار سے دبا کر مفہوم پورا کر دیا۔

''ارے تمہارے ہاتھ تو بالکل برف ہو رہے ہیں!''..... مظفر نے اس کا ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیا اور آہستہ آہستہ دبانے لگا۔ اب اس کی آنکھیں سینما کے پردے پر ضرور تھیں لیکن اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا، جیسے ہر چیز سو گئی تھی۔ بس دونوں کے ہاتھ جاگ رہے تھے اور ہاتھوں سے نکلتا ہوا کرنٹ عجب لطف دے رہا تھا۔ مظفر کے لئے یہ تجربہ بڑا انوکھا تھا۔

ہاتھوں کا یہ کھیل فلم کے آخری سین تک جاری رہا۔

urdunovelist.blogspot.com

دوسرے دن جب شام کو مظفر نینی سے ملنے اس کے ہوسٹل پہنچا تو نینی نے بڑے پیار سے اسے سمجھایا تھا۔

''مظفر، کیا بند کتاب کو بغیر کھولے پڑھا جا سکتا ہے؟'' اس نے پوچھا تھا۔

''میرے خیال سے نہیں۔''

''کیوں؟''..... اس سے سوال کیا گیا۔

''اس لئے کہ کتاب پڑھنے کے لئے اسے کھولنا اور ورق پلٹنا ضروری ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو مظفر!..... لیکن اس دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو میز پر رکھی ہوئی کتاب کو بغیر کھولے اور ورق الٹے پڑھنا چاہتے ہیں۔ کیا ایسے لوگ اس کتاب سے کوئی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں؟''

''ہرگز نہیں۔''

''مظفر، عورت بھی تو بند کتاب کی طرح ہوتی ہے۔ اسے پڑھنے کے لئے بھی تو کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ غائب ہو گئی تھی۔

اور اس شام مظفر بڑی دیر تک یہ سوچتا رہا تھا کہ نینی جو عورت تھی اور بند کتاب کی طرح تھی اس کو کھول کر کس طرح پڑھا جائے۔ کیا عورت کو سمجھنا اتنا ہی آسان ہے جتنا ایک کتاب کو پڑھنا؟

عید سے دو دن پہلے نینی نے اچانک گھر جانے کا پروگرام بنایا۔ نینی کے والد ریلوے پولیس میں کسی اچھے عہدے پر تھے، اس لئے نینی کو جب بھی گھر جانا ہوتا تو وہ اپنے ڈیڈی کو خط لکھ دیتی وہ ادھر سے کوئی سپاہی بھیج دیتے۔ اور یوں نینی بخیر و عافیت پولیس کی نگرانی میں اپنے گھر پہنچ جاتی..... یہ پروگرام کیونکہ اس نے اچانک بنایا تھا، اس لئے وقت کم ہونے کی وجہ سے وہ اپنے ڈیڈی کو مطلع نہ کر سکتی تھی اور نہ ہی وہ تنہا سفر کرنا چاہتی تھی۔

مجبوراً مظفر کو اس کا ہم سفر بننا پڑا۔

فرسٹ کلاس کے دو برتھوں والے اس کوپے میں وہ دونوں اکیلے تھے اور اپنی اپنی برتھوں پر خاموشی سے بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ گاڑی کے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ کبھی کبھی

کہیں دور کوئی روشنی دکھائی دے جاتی تھی۔ اور گاڑی اپنی پوری رفتار سے دھڑ دھڑاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

''کوئی بات کیجئے نا.....!'' نینی خاموشی سے اُکتا چکی تھی۔

''کچھ تم ہی بولو.....!'' مظفر کا ذہن بالکل خالی تھا۔

پھر نینی نے ہی باتیں شروع کر دی تھیں۔ اپنے گھر کی، اپنی سہیلیوں کی، پروفیسروں کی اور جانے کیا کیا..... مظفر خاموشی سے سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔

سفر ختم ہونے میں دو تین گھنٹے باقی تھے۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی اور مظفر اسی طرح اپنی برتھ پر جما ہوا تھا جیسے ابھی ابھی آ کر بیٹھا ہو۔ نینی نے لاکھ اصرار کیا تھا کہ آپ لیٹ جایئے میں بستر کھولے دیتی ہوں، لیکن اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ دو تین گھنٹے کی اور بات ہے، اب کیا لیٹنا!

اگرچہ مظفر اس کے سامنے ہی تھا اور مشکل سے اس کے درمیان دو تین فٹ کا فاصلہ تھا، لیکن نینی کو یہ فاصلہ ہزاروں میل کا لگ رہا تھا..... اس نے کچھ سوچ کر اپنے سوٹ کیس سے بہت سے عید کارڈ نکالے، اور ان پر پتے لکھنے بیٹھ گئی۔

''بھئی، یہ کیا کرنے لگیں آپ؟'' مظفر کسمسایا۔

''آپ کو عید کارڈ بھیجنے لگی ہوں؟'' نینی خاموشی سے اپنے دل کی بات کہہ گئی۔

''میں اتنا دور تو نہیں کہ آپ عید کارڈ کے ذریعے مبارکباد دیں۔''

نینی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہاں اسے ترچھی نظروں سے ضرور دیکھا۔

''عید کارڈ کہاں کہاں بھیج رہی ہیں ہم بھی تو دیکھیں.....'' مظفر غیر ارادی طور پر اُٹھ کر اس کی برتھ پر چلا گیا۔

''ہاں کیوں نہیں..... میں پتے لکھتی جاتی ہوں، آپ دیکھتے جایئے اور ٹکٹ لگاتے جایئے۔ پھر کوئی اسٹیشن آئے تو پوسٹ بھی کر دیجئے گا تاکہ وقت پر لوگوں کو مل جائیں۔''

نینی عید کارڈوں پر پتے لکھ لکھ کر اسے دیتی گئی اور وہ معائنہ کرنے کے بعد ان پر ٹکٹ چسپاں کرتا گیا۔ یہ سارے کارڈ اس کی سہیلیوں کے نام تھے۔ آخری عید کارڈ پر نینی نے پتہ لکھنے کے بعد خود ہی اس پر ٹکٹ لگایا اور لفافہ بند کر کے ایک نظر مظفر کو دیکھا اور لفافہ سوٹ کیس میں ڈال دیا۔

urdunovelist.blogspot.com

مظفر کے اندر سویا ہوا شکی مزاج مرد یکا یک جاگ پڑا۔ یوں چہرے کے تاثرات سے اس نے شکی مزاج مرد کے اُٹھنے کی اطلاع نہ ہونے دی لیکن زبان چپ نہ رہ سکی.....

''کیا وہ کارڈ پوسٹ نہیں کروائیں گی آپ.....؟'' مظفر نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے مہذبانہ انداز میں کہا۔

''نہیں.....اسے میں اپنے ہاتھ سے پوسٹ کرنا چاہتی ہوں.....'' نینی نے اس کے تجسس کو اور شعلے دکھائے۔

''کسے بھیج رہی ہیں وہ عید کارڈ۔ ہمیں بھی تو دکھائیں!''

''اگر نہ دکھاؤں تو.....؟''

''تو اسے میں اپنی توہین سمجھوں گا۔''

''کیا کسی لڑکی پر شک کرنا، لڑکی کی توہین نہیں۔''

''یہاں مسئلہ کسی لڑکی کا نہیں.....میرا اور تمہارا ہے۔''

''مجھ پر اعتماد ہے آپ کو؟''

''ہاں کیوں نہیں۔''

''پھر بھول جائیے اس عید کارڈ کو۔''

''تم آخر عید کارڈ دکھانے سے گریز کیوں کر رہی ہو؟''

''یہ ایک راز ہے۔''

''آج میں بھی اس راز کو کھول کر رہوں گا۔''

نینی نے بلاوجہ بحث کر کے اس مسئلے کو اتنا اہم بنا دیا تھا کہ مظفر جیسا سنجیدہ آدمی بے چین ہو اُٹھا تھا، اور وہ جلد سے جلد سوٹ کیس میں رکھے ہوئے عید کارڈ کو دیکھ لینا چاہتا تھا۔

مظفر نے جوں ہی سوٹ کیس کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ نینی نے بڑی سختی سے اسے ایسا کرنے سے روکا لیکن وہ نہ مانا۔ ادھر اس نے سوٹ کیسے سے عید کارڈ نکالا، ادھر نینی دوسری برتھ پر دھم سے گری۔ وہ روٹھ گئی تھی۔

لفافے پر لکھے ہوئے پتے کو مظفر نے بڑی بے تابی سے دیکھا، لیکن لفافے پر کوئی مردانہ نام نظر

نہ آیا۔ یہ عید کارڈ بھی اس کی ایک سہیلی کے نام تھا۔

مظفر اپنی اس حرکت پر بہت نادم تھا۔ اس نے نینی پر شک کر کے اس کی توہین کی تھی۔ نینی دوسری برتھ پر ہاتھوں میں سر دیئے لیٹی تھی۔ اس کا جسم ہلکورے لے رہا تھا۔ شاید وہ دھیرے دھیرے سسک رہی تھی۔

''مجھے معاف کر دو نینی.....!'' مظفر نے اس کے پاس بیٹھ کر کہا۔

نینی خاموش رہی۔

''نینی بولو گی نہیں؟''.....اس نے ہمت کر کے اس کے بالوں کو چھوا۔

''مجھے مت چھوئیے۔''

''اُف خدایا.....اتنی ناراضگی!''

''جائیے اب میں آپ سے کبھی نہیں بولوں گی۔''

''کیوں، کیوں.....؟''

''آپ مجھ پر اعتماد جو نہیں کرتے.....دیکھ لیا کارڈ، ہو گئی تسلی!''

مظفر نے نینی کے چہرے کو اس کے ہاتھوں سے نکالا۔ نینی نے آنکھیں بند کیں تو رخسار پر آنسوؤں کی لکیر سی کھنچ گئی۔ مظفر نے بے اختیار اس کی آنکھیں چوم لیں۔ پھر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ نینی کچھ نہ بولی۔ اس نے اس کی پیشانی کو ہونٹوں سے چھوا۔ نینی خاموش رہی۔ پھر اس نے ہمت کر کے اس کے ترشے تراشے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے.....نینی ذرا تڑپی.....پھر بات بڑھتی گئی، بڑھتی گئی.....لیکن ایک حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔

مظفر کے گھر والوں نے مظفر کی رضامندی سے خالہ زاد بہن کے ساتھ اس کی منگنی کر دی۔ اور مظفر نہ تو اپنے گھر والوں کو اپنے دل کی بات بتا سکا اور نہ ہی منگنی ہونے کی اطلاع نینی کو دے سکا۔ بزدلی پھر آڑے آ گئی تھی۔

اب مظفر پریشان رہنے لگا تھا۔ پڑھائی سے دل اُچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ منگنی والی بات نینی سے زیادہ عرصے تک چھپی نہیں رہے گی۔ کیا وہ خود ہی اسے سب کچھ بتا دے!.....لیکن کس طرح بتائے۔ نینی کیا سوچے گی! وہ اس خبر کو کس طرح برداشت کرے گی۔ بہتر یہی ہے کہ نینی سے

urdunovelist.blogspot.com

آہستہ آہستہ کنارہ کشی اختیار کرلی جائے۔ ہاں یہی مناسب ہے۔

لیکن کنارہ کشی اختیار کرنے کے لئے بھی ہمت کی ضرورت تھی۔ نینی جیسی لڑکی کو بھول جانا آسان کام نہ تھا..... اور یوں مظفر کا سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔

نینی مہینے میں ایک آدھ آؤٹنگ کا پروگرام بنالیتی، اور مظفر کو خوشی سے اس کا ساتھ دینا پڑتا۔

ریسٹ ہاؤس کے چھوٹے سے کمرے میں اگرچہ دو بیڈ پڑے تھے، لیکن وہ دونوں کمبل اوڑھے لیٹے تھے۔ باہر ہوا بہت تیز تھی۔ درختوں کے پتے چیخ رہے تھے۔ ہوا کا یہ شور کبھی اتنا بڑھ جاتا کہ یوں محسوس ہوتا جیسے ریسٹ ہاؤس کی دیواریں بھی اس ہوا کے ساتھ اُڑ جائیں گی اور کبھی ہوا کی یہ چنگھاڑ دھیمی ہوجاتی۔

جوں ہی ہوا کے سمندر میں جوار بھاٹا آتا، لہروں کا شور بڑھ جاتا۔ تو نینی سمٹ کر مظفر کی بانہوں میں آجاتی۔ اپنا سر اس کے بالوں بھرے سینے پر رکھ دیتی اور مظفر دھیرے دھیرے اس کی زلفوں کے پیچ کھولنے لگتا۔

کچھ دیر کے بعد نینی نے اپنی مخملی انگلیوں سے مظفر کا چہرہ ٹٹولا اور اس کے کان میں دھیرے سے بولی۔

''کچھ ہے.....؟''

''کیا تمہیں بھوک لگی ہے؟'' مظفر بولا۔

''لاحول ولا.....'' نینی ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہوگئی۔ اُٹھ کر کمرہ روشن کیا۔ مظفر کا سوٹ کیس کھولا اور اس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔

''نینی، کیا دیکھ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں..... جو مجھے چاہئے وہ میں خود ہی دیکھ لوں گی!''

''کچھ بولو تو! میں تمہیں بتادوں گا کہ تمہاری مطلوبہ شے میرے سوٹ کیس میں ہے یا نہیں!''

''آپ خاموشی سے لیٹے رہیں اور اپنی زبان بند رکھیں۔''

نینی نے سوٹ کیس کی تلاشی لینے کے بعد مایوسی سے اسے بند کیا اور ایک گہری سانس لے کر مظفر کو دیکھا۔

''نہیں ملا.....؟'' مظفر نے کمبل سے منہ چمکایا۔

''نہیں۔'' نینی نے شانے اُچکا کر کہا۔

''تمہیں ریوالور کی تلاش تو نہیں!..... کیا خودکشی کرنے کا ارادہ ہے؟'' مظفر نے اسے چھیڑا۔ شاید اس طرح کچھ بتادے، لیکن وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔

''آپ کے سوٹ کی تلاشی لے سکتی ہوں؟''

''شوق سے، لیکن یاد رکھئے، میری جیب سے کسی دوسری لڑکی کے نام محبت نامہ برآمد نہیں ہوگا۔''

نینی نے ہینگر پر لٹکا ہوا مظفر کا سوٹ بری طرح کھنگال ڈالا، اور پھر کٹی پتنگ کی طرح اس پر آگری۔ اس کی ناک پکڑتے ہوئے بولی۔ ''احمق ہیں آپ!..... خالی ہاتھ چلے آئے۔''

''کون کہتا ہے، ہم خالی ہاتھ آئے ہیں۔ ضرورت کی ہر چیز ہمارے پاس ہے۔''

''بکواس کرتے ہیں آپ!''

اور اس سے پہلے کہ مظفر کچھ بولے۔ نینی نے اس کے ہونٹ اپنے ہونٹوں سے سی دیئے، لیکن مظفر کا ذہن نہ سی سکی۔ مظفر سوچتا رہا..... آخر اس تلاشی کا کیا مطلب تھا۔ اسے کس چیز کی تلاش تھی ..... ممکن ہے یہ چھاپہ اس نے اندھیرے کے تیر کی طرح مار دیا ہو، لیکن نینی اندھیرے کے یہ تیر کیوں چلا رہی ہے۔ اسے کس انکشاف کی توقع ہے۔ یہ کیا چاہتی ہے!

مظفر کے اصرار کے باوجود نینی نے اس سلسلے میں اپنی زبان نہ کھولی۔ جب اصرار حد سے بڑھا تو وہ ٹال گئی۔ اس موضوع پر اس نے بات کرنے سے ہی انکار کردیا..... لیکن وہ دونوں جب بھی اس تفریحی مقام پر ایک دو رات کے لئے آتے، تو نینی اس سے یہ ضرور پوچھتی۔

''کچھ ہے.....؟''

''اس بار کچھ لائے ہیں.....؟''

اور جب وہ اس سے اس شے کا نام پوچھتا، تو وہ پراسرار طور پر خاموش ہوجاتی، اور اسے اپنی بانہوں میں بھر لیتی، اور مظفر سب کچھ بھول کر اس کے جسم کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا..... یوں تو مظفر کے ہاتھ اس کے جسم پر بلا روک ٹوک دندناتے پھرتے، لیکن مظفر کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے کی اجازت نہ تھی۔

urdunovelist.blogspot.com

مظفر چاہتا تو اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کیلئے نصیر سے مشورہ کر سکتا تھا لیکن نصیر کو تو سوائے کارڈ والے پرچے کے کچھ معلوم نہ تھا۔ پھر وہ اسے کیسے بتاتا کہ معاملہ پرچے سے نکل کر ''جوانی'' تک جا پہنچا ہے، اور اب یہ مسئلہ درپیش ہے۔ مظفر کو کلاس کا ہر لڑکا بے حد شریف سمجھتا تھا اور خود بھی وہ لڑکیوں کے ذکر سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ اب نصیر کو اپنا کچا چٹھا بتا کر اپنے وقار کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ کیسے لگاتا۔ دوسری طرف نینی کی بدنامی کا بھی سوال تھا۔

لہٰذا یہ مسئلہ جوں کا توں رہا اور پھانس بن کر اس کے دل میں چبھتا رہا۔

امتحان سے فارغ ہونے کے بعد مظفر کے گھر والوں نے شادی کی تیاری شروع کر دی اور جب وہ دونوں آخری بار ریسٹ ہاؤس میں ملے تو اس رات مظفر بہت رویا۔

نینی اسے ہکا بکا سی دیکھتی رہی۔ پھر اس نے مظفر کے آنسو پونچھتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

''مظفر! خدا کے لئے اس طرح نہ روؤ! میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، کچھ بتاؤ تو آخر ہوا کیا؟''

''میری شادی ہو رہی ہے، اور میں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔'' مظفر نے اپنی ہچکیوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

اور یہ سن کر نینی زرد ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نے جنم لیا۔ اس نے جھک کر لڑکیوں کی طرح روتے ہوئے مظفر کی پیشانی چومی اور انگلیوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''مظفر، خدا کے لئے یہ رونا بند کر دیجئے۔ مجھ سے یہ آنسو نہیں دیکھے جاتے..... پلیز مظفر!''

''مجھے دکھ یہ ہے نینی کہ میں تمہیں کچھ نہ دے سکا.....'' اس کے آنسو اب بھی جاری تھے۔

''کوئی بات نہیں مظفر.....! مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں۔ شکوہ اپنی قسمت سے ہے..... کاش میں نے ایک بزدل کو نہ چاہا ہوتا۔''

اور پھر وہ بچھڑ گئے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ ایک ٹیس سی دلوں میں لئے۔ مظفر بڑے عرصے تک تکیے پر سر پٹک پٹک کر روتا رہا اور اسے یاد کرتا رہا۔

ایم اے کے بعد مظفر نے لائبریری سائنس میں ڈگری لے لی اور یونیورسٹی کی لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔

شادی کے بعد اگرچہ نینی کی یاد میں بڑی حد تک کمی آ گئی تھی۔ لیکن وہ بات ابھی تک اس کے ذہن میں پنجے گاڑے بیٹھی تھی اور وہ آٹھ دس سال گزر جانے کے باوجود اس گتھی کو نہ سلجھا سکا تھا کہ وہ رات کے اندھیرے میں اس کے سوٹ کیس اور سوٹ میں کیا تلاش کیا کرتی تھی۔ اور ''کچھ ہے؟'' کہہ کر کیا مانگا کرتی تھی!

لیکن آج جب وہ لڑکی لائبریرین مظفر کی میز پر اپنا ہینڈ بیگ چھوڑ گئی تھی اور اس نے بیگ کھول کر دیکھ لیا تھا اور بیگ کھولتے ہی جو چیز پھسل کر سب سے پہلے میز پر گری تھی.....

تو اچانک کہیں سے نینی کی آواز آئی تھی۔

''کچھ ہے!''

اور دس سال سے دل میں چبھی ہوئی پھانس مکھن میں بال کی طرح کھنچ گئی تھی۔

وہ ایک چھوٹا سا چوکور پیکٹ تھا..... جس میں ''فرانس کا لیدر'' بند تھا۔ □□

urdunovelist.blogspot.com

ٹرین

ناول پڑھتے پڑھتے میں نے یوں ہی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کھڑکی کا پردا ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے کپکپا رہا تھا۔ غالباً کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ میں نے ایک اچٹتی سی نظر اپنی بیوی پر ڈالی، وہ حسب معمول لحاف اوڑھے سو رہی تھی۔ آٹھ بجتے ہی وہ لحاف میں منہ لپیٹ کر پڑ جاتی کیونکہ صبح اسے تین بجے اُٹھنا پڑتا تھا۔ میری ڈیوٹی پانچ بجے کی تھی۔ میں ایک پرنٹنگ پریس میں اسسٹنٹ منیجر کی حیثیت سے ملازم تھا، پریس ٹھیک وقت پر پہنچنے کے لئے مجھے چار بجے گھر سے نکلنا پڑتا تھا۔ تین بجے اُٹھنے کے لئے اگر وہ آٹھ بجے سو جاتی تھی تو اس میں تعجب کی کیا بات تھی۔

ہوا کے ایک اور برفیلے جھونکے نے مجھے اُٹھنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے لحاف سرکا کر ناول تکیے پر رکھا اور پاؤں میں چپل ڈالتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ تب ہی کھڑکی میں روشنی سی دکھائی دی۔ میں نے پردا ہٹا کر آسمان پر نظر ڈالی۔ دور کہیں بجلی چمک رہی تھی۔ کھڑکی بولٹ کر کے میں نے پردہ برابر کیا۔ واپس پلٹا تو بادلوں کی گرج سنائی دی، غالباً بارش شروع ہونے والی تھی۔ باہر صحن میں کچھ کپڑے پھیلے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی جلدی تار سے گیلے کپڑے گھسیٹے اور ایک ایک کر کے انہیں کمرے میں مختلف جگہوں پر پھیلا دیا اور پھر اطمینان سے ناول پڑھنے لگا۔

دو چار منٹ کے بعد ہی بارش شروع ہو گئی اور بارش بھی خاصی شدید تھی۔ سردی پہلے ہی کیا کم تھی،

اس موسلا دھار بارش نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ باہر دھماکوں پر دھماکے ہو رہے تھے۔ ہوا چیخ رہی تھی، بجلی کڑک اور بادل کی گرج زور و شور سے جاری تھی۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔ یوں لگا جیسے اپنے مکان پر بجلی گری ہے۔ بجلی کہیں دور گری تھی لیکن دل دہلا گئی۔ دھماکے کی آواز نے میری بیوی کو بھی متاثر کیا۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور میری طرف متوحش نظروں سے دیکھنے لگی۔

''کچھ نہیں ہوا جان!'' میں نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ''بارش ہو رہی ہے بارش۔ تم آرام سے سو جاؤ۔''

''باہر کپڑے.....!''

''وہ پڑے ہیں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

میری بیوی نے اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے کپڑوں پر مطمئن انداز میں نظر ڈالی۔ پھر بالوں کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے بولی۔ ''شکریہ۔''

''اتنی دور سے شکریہ۔ ذرا ادھر آیئے۔''

''آپ ابھی تک سوئے نہیں۔''

''ابھی کیا بجا ہے۔'' میں نے مڑ کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''ساڑھے نو بجے ہیں۔ بھئی میں تو ساڑھے دس بجے تک سوتا ہوں۔''

میری بیوی نے ٹھیک ہے، کے انداز میں گردن ہلائی اور چپل گھسیٹتی ہوئی باتھ روم میں گھس گئی جب وہ باہر نکلی تو میں نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

''جی!'' وہ میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔

میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف گھسیٹا۔

تب ہی دروازے پر کسی نے دستک دی۔ دھت تیرے کی۔ میری گرفت بیوی پر ڈھیلی ہو گئی۔

''کوئی ہے دروازے پر؟'' وہ بولی۔

''شاید۔'' میں نے دستک پر کان لگا دیئے۔

چند لمحوں تک کوئی آواز نہ آئی۔ طوفانی بارش اب بھی جاری تھی۔ میں نے پھر اپنی بیوی کو قریب

urdunovelist.blogspot.com

کرلیا۔ تب ہی ''دھڑ دھڑ'' کسی نے پھر دروازہ دھڑ دھڑایا۔

''کون آ گیا اس وقت۔'' میری بیوی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''ٹھہرو دیکھتا ہوں سالے کو۔'' میں دانت پیستا ہوا اُٹھا۔

''نہیں، یہ میرا بھائی نہیں ہوسکتا۔'' میری بیوی نے بڑی معصومیت سے کہا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

میں یہ اندازہ کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا کہ اس وقت کون آ سکتا ہے لیکن کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ بہر حال جو بھی آیا تھا وہ انتہائی غلط وقت پر آیا تھا۔

دروازہ کھولتے ہی میں حیرت زدہ سا رہ گیا۔ دروازے پر شاہد کسی بھیگے چوہے کی طرح کھڑا تھا۔

''شاہد تم۔'' میں نے جلدی سے ہاتھ پکڑ کر اسے ڈرائنگ روم میں گھسیٹا اور دروازہ بند کر دیا۔

دروازہ کھلتے ہی برفیلی ہوا نے دھاوا بول دیا تھا۔ میری تو فوراً ہی کپکپی چھوٹ گئی۔ باہر بے حد سردی تھی۔

شاہد کو ڈرائنگ روم میں کھڑا چھوڑ کر میں تیزی سے اندر گیا۔ میری بیوی سوالیہ نشان بنی بیٹھی تھی۔

''شاہد ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''تم ذرا میرا سلیپنگ سوٹ نکال دو اور کمبل بھی دے دو۔''

''شاہد بھائی آئے ہیں، اس وقت۔ خیریت تو ہے؟'' میری بیوی الماری کھولتے ہوئے بولی۔

''ابھی تو وہ سردی کی وجہ سے چھوارا بنا ہوا ہے۔ ہوش ٹھکانے آئیں تو پھر کچھ پوچھوں۔''

''یہ لیجئے۔''

میں بیوی کے ہاتھ سے سلیپنگ سوٹ لے کر ڈرائنگ روم میں آیا۔ سوٹ شاہد کی طرف اُچھالتے ہوئے بولا۔ ''جلدی سے بھیگے کپڑے اتار دو۔''

شاہد کوٹ پہلے ہی اُتار چکا تھا۔ گلے سے ٹائی کھینچتے ہوئے اس نے سلیپنگ سوٹ تھام لیا۔ میں ڈرائنگ روم کا دروازہ بند کر کے بیڈ روم میں آ گیا۔ میری بیوی نے کمبل میری طرف بڑھایا۔

''جان، تم اب سو جاؤ۔ میں شاہد کو دیکھتا ہوں۔'' میں نے کمبل لیتے ہوئے کہا۔

''کافی نہیں پینی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کافی کے بغیر تو کام نہیں چلے گا لیکن میں بنالوں گا۔''

''نہیں ہم بنائیں گے۔ آپ شاہد بھائی کے پاس بیٹھیں۔''

''او کے جان۔'' میں نے ڈرائنگ روم کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔

شاہد کپڑے تبدیل کر چکا تھا۔ وہ ہاتھ بغلوں میں دیئے، صوفے پر سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے بغلوں سے ہاتھ نکال لئے اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے کمبل کھول کر اسے اڑھایا اور اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے سگریٹ دو۔'' اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے سگریٹ کی فرمائش کی۔

میں دوسرے کمرے سے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس اُٹھا لایا۔ میری بیوی باورچی خانے میں تھی۔ وہاں سے پیالیوں کی آواز آ رہی تھی۔

''لو سگریٹ۔'' میں نے سگریٹ کا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔ ''تمہارے لئے کافی بھی بن رہی ہے۔''

شاہد نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر دو چار لمبے کش کھینچے اور پھر ڈرائنگ روم میں لگی ایک پینٹنگ کو گھورنے لگا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟'' میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

''میں!'' اس نے تین بار سگریٹ کو ایش ٹرے میں جھٹکا اور پھر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ''فلم دیکھ کر آ رہا ہوں۔''

''اور کون تھا، تمہارے ساتھ۔''

''کوئی نہیں، آج میں نے تنہا فلم دیکھنے کا تجربہ کیا تھا۔ سچ کہتا ہوں بڑا مزا آیا۔ فلم دیکھ کر نکلا تو بارش شروع ہو چکی تھی۔ دور تک سواری کا پتہ نہ تھا، میں پیدل ہی چل پڑا۔'' اس نے سگریٹ کا طویل کش لیا۔

''عجیب احمق آدمی ہو تم، اگر پیدل ہی سینما سے آنا تھا تو تھوڑی دیر رک جاتے۔ بارش رکنے کا تو انتظار کیا ہوتا۔''

''کون کس کا انتظار کرتا ہے یار، بس بھیگتا ہوا چل پڑا۔ تم سے کیونکہ کئی روز سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے ادھر آ گیا اور سناؤ کیا حال چال ہیں۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

urdunovelist.blogspot.com

یہ سن کر میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایسا دوست کسی کا ہوسکتا ہے؟ ایسی سخت سردی اور ایسی طوفانی بارش میں جبکہ لوگ اپنے لحافوں میں دبکے پڑے ہیں وہ بے چارہ تین میل سے بھیگتا ہوا میرے حال چال معلوم کرنے آیا تھا۔

''او شریف آدمی، میری خیریت معلوم کرنے کے لئے اتنی زحمت کی کیا ضرورت تھی کاش تم سیدھے گھر گئے ہوتے۔''

''گھر تو روز ہی جاتے ہیں یار اور یہی سوچ کر میں گھر جاتے جاتے پلٹ پڑا۔''

ڈرائنگ روم کے پچھلے دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازے کے پیچھے میری بیوی گرم گرم کافی کی ٹرے لئے کھڑی تھی۔ ٹرے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی۔ ''خیریت تو ہے۔''

''ہاں، سب خیریت ہے۔ وہ ہماری خیریت معلوم کرنے آیا ہے۔''

''آداب بھابھی۔'' میری بیوی کی آواز سن کر اس نے سلام مارا۔

''آداب بھیا۔'' میری بیوی نے کہا۔ ''ایسی بارش میں گھر سے نکلنے کی کیا ضرورت تھی، اور کامنی تو ٹھیک ہے۔'' اسی طرح کی دو چار رسمی باتیں کر کے میری بیوی نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے کافی کا مگ اس کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ''شاہد! آخر تم چیز کیا ہو؟''

اس نے پہلے تو ایک زوردار قہقہہ لگایا، پھر آہستہ سے بولا۔ ''میں ٹرین ہوں۔''

''وہ ٹرین جو ایک اسٹیشن سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے اسٹیشن کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ جس کی منزل ہوتے ہوئے بھی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ سدا گردش میں رہتی ہے۔'' میں نے وضاحت کر کے اس سے تصدیق چاہی۔

''ہاں میں وہی ہوں۔ میں ہر لمحے تبدیلی چاہتا ہوں۔ آئی وانٹ چینج بس کچھ ہونا چاہئے، کچھ ہوتے رہنا چاہئے۔''

شاہد میرے پرانے دوستوں میں سے تھا لیکن میرے لئے آج بھی اجنبی تھا میں باوجود کوشش کے اسے آج تک نہ سمجھ سکا تھا۔ ویسے بھی انسانی نفسیات سے مجھے ذرہ بھر بھی دلچسپی نہیں ہے۔ میں دو اور دو کو چار سمجھتا ہوں، پانچ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ سیدھی سادی زبان میں، میرے نزدیک شاہد ایک غیر مستقل مزاج آدمی تھا اور وضاحت چاہیں تو سیماب صفت کہہ لیں۔

شاہد جب چھوٹا سا تھا تو گھنٹوں ریلوے پُل پر کھڑے ہو کر ٹرینوں کی آمد و رفت کا تماشا دیکھا کرتا تھا۔ پُل کے نیچے بچھی ہوئی لوہے کی پٹریوں میں جانے ایسی کیا بات تھی کہ اس کی نظریں دور تک پھیلے ہوئے اس لوہے کے جال میں اُلجھ کر رہ جاتی تھیں۔ اسی پل پر کھڑے کھڑے اس نے سوچا کہ وہ پہلی جماعت سے ہی اوّل آتا رہا تھا۔ گھر اور محلے کے سارے لوگ اس کی ذہانت کی تعریف کیا کرتے تھے۔ والدین کو اس کے رزلٹ کی بالکل فکر نہ تھی کیونکہ اس کا اوّل آنا یقینی تھا۔ آخر وہ اوّل کیوں آتا ہے۔ پھر اس نے اس سال بالکل محنت نہ کی اور آٹھویں میں ''اچھے نمبروں'' سے فیل ہو گیا۔ گھر میں ایک شور سا اُٹھا۔ محلے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور شاہد ان سب کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد اس نے سائنس چھوڑ دی، آرٹس کے مضامین لے لئے۔ انٹر کے بعد والد نے اسے طبیہ کالج میں داخل کرا دیا کہ حکیم بن کر کچھ کما کھائے گا۔ ایم اے، بی اے کی ڈگری سے تو چائے تک نہیں بنتی۔ لیکن طب میں اس کا دل نہ لگا، پھوڑے پھنسیوں کے تصور ہی سے اسے قے آنے لگتی تھی۔ ایک سال بعد ہی اس نے طبیہ کالج چھوڑ دیا۔ پھر بی اے میں داخلہ لیا اور وہ مضامین نہ لئے جو انٹر میں اس کے پاس تھے۔ بی اے کے دوران کئی بار اِدھر اُدھر ملازمت کی کوشش کی لیکن کہیں دال نہ گلی۔ گریجویشن کے بعد اس نے انگلش میں ایم اے کرنے کی ٹھانی۔ انگلش میں ماسٹر کی ڈگری لینے کے بعد اس نے لائبریری سائنس میں داخلہ لے لیا۔ لیکن کلاسیفکیشن اور کیٹالاگنگ جیسے سبجیکٹ نے اسے بولا دیا۔ وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ والد کے کہنے پر وکالت میں داخلہ لے لیا، لیکن یہ گاڑی بھی ایک سال سے زیادہ نہ چلی۔ وکالت چھوڑ کر اس نے کالج میں مدرسی کر لی۔ یہ درس و تدریس دو سال جاری رہی۔ وہاں سے چھلانگ لگا کر وہ ایک انگریزی کے روزنامے میں آ گیا۔ چھ مہینے وہاں کام کیا، پھر ایک میگزین میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ یوں تو وہ آج بھی ایک انگلش میگزین کا اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا لیکن اب تک کئی ادارے تبدیل کر چکا تھا۔

کچھ ایسا ہی حال اس کی تحریروں کا تھا۔ پہلے اس نے شاعری پر ہاتھ صاف کیا۔ دو چار الٹی سیدھی غزلیں اِدھر اُدھر چھپوا کر اس نے نثر نگاری شروع کر دی، کچھ مزاحیہ چیزیں لکھیں۔ پھر رومانی موڈ طاری ہوا تو افسانہ نگاری شروع کر دی۔ اچھے خاصے افسانے لکھتے لکھتے جانے کیا جی میں سمائی کہ

urdunovelist.blogspot.com

جدیدیت پر اُتر آیا۔ ایک جدید افسانہ لکھا۔ اس نے مجھے بھی سنایا۔ جب اس نے محبوبہ کی نیلی آنکھوں سے پورا سانپ گزار دیا تو میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خدا کا واسطہ دے کر اس سے اس خرافات کو بند کرنے کے لئے کہا۔ وہ فوراً برا مان گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ افسانہ نگاری چھوڑ کر اس نے تنقیدی مضامین لکھنے شروع کر دیئے پھر ان سے بھی اُکتا گیا۔ آج کل ڈرامہ نگاری ہو رہی ہے۔ خدا جانے یہ کتنے دن کی مہمان ہے۔ میں نے اکثر اسے سمجھایا کہ اللہ کے نیک بندے کہیں تو ٹھہر، کیوں اپنی صلاحیتیں ضائع کر رہا ہے لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ وہ اُلٹے میرے گلے پڑ جاتا۔

''یار، تم بجلی کے کھمبے ہو کھمبے۔'' وہ جھنجھلا کر کہتا۔

میں اس کی بات سن کر مسکرا دیتا۔ وہ سلسلہ کلام جاری رکھتا۔

''تمہیں روزِ اوّل سے جہاں گاڑ دیا گیا ہے، وہیں جمے کھڑے ہو۔ تم ایک پریس میں دس سال سے ملازم ہو، میری نظر میں تم اس پریس میں دس سال سے قید ہو۔ تم اسے اپنی مستقل مزاجی کہہ سکتے ہو لیکن سچی بات یہ ہے کہ تم میں خود اعتمادی کی کمی ہے۔ مجھ سے جس وقت کہو اپنی سروس چھوڑ دوں۔ میں بھوکا ہرگز نہیں مروں گا۔ کہیں نہ کہیں مجھے سروس مل جائے گی۔ مجھے اپنی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد ہے۔'' اس نے آخری جملہ بھاری آواز میں ادا کیا۔

''یار تم، شادی کر لو۔'' میں نے اس کی باتوں پر ذرا توجہ نہ دی۔ ''ممکن ہے اس طرح استحکام پیدا ہو جائے۔''

''استحکام!'' اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''کدھر ہے استحکام بابا، زندگی تبدیلیوں کا نام ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ ٹوٹ پھوٹ رہی ہے۔ تبدیل ہو رہی ہے۔ وقت کو ایک پل قرار نہیں۔ یہ دنیا جب سے وجود میں آئی ہے، گھومے جا رہی ہے۔ خود انسان کو قرار نہیں۔ کل تک شیر خوار تھے، پھر بچپن سے نکلتے ہوئے جوانی میں قدم رکھا۔ اب تم ادھیڑ عمر کے آدمی ہو۔ اپنی عمر طبعی پوری کر کے ایک دن قبر میں اتر جاؤ گے۔ تبدیلی کا عمل پھر بھی جاری رہے گا۔ تمہاری لاش گلے گی، سڑے گی، پھر تمہاری ہڈیوں پر یہی عمل دُہرایا جائے گا۔ اب بتاؤ کہاں ہے استحکام۔ زندگی تو زندگی موت بھی تبدیلیوں سے خالی نہیں۔'' پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اس نے کہا۔ ''رہی شادی، شادی میں بہر حال کروں گا، بس

کسی اچھی لڑکی کا انتظار ہے۔''

مجھ سے اس دن غلطی ہو گئی کہ میں نے شاہد سے اچھی لڑکی کی وضاحت نہ چاہی۔ میرا خیال تھا کہ اچھی لڑکی سے اس کی مراد واقعی اچھی لڑکی ہو گی یعنی پڑھی لکھی، خوبصورت، برسر روزگار اور اچھے گھرانے کی۔ وہ ظالم نشیمن سے ایک لاوارث لڑکی اُٹھا لایا۔ اگر مجھے پہلے سے پتہ چل جاتا تو میں ہرگز اسے ایسی لڑکی سے شادی نہ کرنے دیتا جس کے ماں باپ کا کوئی علم نہ تھا۔ خدا جانے وہ کن حالات اور کیسے ہاتھوں سے گزر کر نشیمن پہنچی تھی۔ میرے خیال میں ایسی لڑکی کو ہمدردی کے تحت گھر میں ملازم تو رکھا جا سکتا ہے لیکن بیوی نہیں بنایا جا سکتا۔

شاہد نے بڑے طمطراق سے آمنہ کو اپنی بیوی بنایا۔ اس نے خود ہی جہیز اکٹھا کیا اور اسے خوش خوش اس طرح گھر لے کر آیا جیسے سب کچھ سسرال سے ملا ہو۔ آمنہ میں سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ بے حد حسین تھی۔ شاید، شاہد اس کی صورت پر ہی مر مٹا تھا۔ شاہد نے فوری طور پر آمنہ کا نام تبدیل کر کے کامنی رکھا۔ یہ نام مجھے بہت اچھا لگا۔ آمنہ تھی بھی واقعی کامنی سی۔

میرا خیال تھا کہ شادی کے بعد شاہد کے مزاج میں استحکام پیدا ہو جائے گا کیونکہ ذمہ داریاں آدمی کو سیدھے راستے پر چلنے کے لئے مجبور کر دیتی ہیں۔ پھر بیوی کا بوجھ تو اچھے اچھے رستموں کی کمریں جھکا دیتا ہے، لیکن شاہد کی صحت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دو تین مہینوں کے بعد ہی شاہد کی بے چین طبیعت نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ ایک دن وہ شطرنج کھیلتے کھیلتے اچانک بول اُٹھا۔

''یار، یہ شادی کا بندھن اپنی سمجھ میں نہیں آتا۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک عورت کے ساتھ پوری زندگی گزارنا کہاں کی شرافت ہے۔''

''دوسری کر لو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے مذہب نے تو چار عورتوں کی اجازت دے رکھی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس مہنگائی کے دور میں جبکہ ایک بیوی کا رکھنا محال ہے تو دوسری کرنے کی کون ہمت کرے گا۔'' اس نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

''اچھا پھر ایسا کرو۔'' میں طنزیہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''کسی شادی شدہ آدمی سے

urdunovelist.blogspot.com

معاہدہ کرلو۔''

''میں تو تیار ہوں۔'' وہ فوراً ہی میری بات سمجھ گیا۔ ''اکبر سے اس سلسلے میں ایک بار بات بھی ہوئی تھی۔ یہ شادی سے پہلے کی بات ہے۔ اکبر کو تو تم جانتے ہو نا، ارے وہی بینک والا لڑکا۔ اس سے ایسے ہی مذاق ہو رہا تھا کہ ایک عورت کے ساتھ لوگ پوری زندگی کس طرح بسر کر لیتے ہیں، ان کی جگہ ہم ہوں تو بہت جلد اکتا جائیں۔ پھر ہم نے معاہدہ کیا کہ شادی کے بعد دونوں کبھی کبھی بیویاں بدل لیا کریں گے مگر مصیبت یہ ہے کہ میں نے شادی کر لی ہے لیکن اکبر ابھی تک کنوارا ہے۔ اب اس معاہدے پر عمل ہو تو کیسے؟''

یہ سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ سچی بات ہے کہ مجھے شاہد سے، اس قدر گر جانے کی توقع نہ تھی۔ اس کی اس بات نے میرے دل میں زخم سا پیدا کر دیا۔ اسی دن میں نے طے کیا کہ اب اپنی بیوی کو شاہد کے سامنے نہ آنے دوں گا۔ اگر شاہد میرا پرانا دوست نہ ہوتا تو اس بات کے بہت امکانات تھے کہ میں ایسے آدمی پر ہاتھ چھوڑ بیٹھتا اور اتنا مارتا کہ وہ آئندہ بیویاں بدلنے کے تصور ہی سے کانپنے لگتا۔

باہر بارش تھم چکی تھی لیکن ہوا اب بھی طوفانی انداز میں چل رہی تھی۔ دروازہ ہوا کے زور سے بار بار بج اُٹھتا تھا۔ ایک بار جو دروازے پر ہوا نے زور سے دستک دی تو میں چونک پڑا۔ میں نے کافی کے مگ ٹرے میں رکھتے ہوئے شاہد کی طرف دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی میری ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ ماچس کی تیلی ہونٹوں میں دبائے سگریٹ ماچس پر رگڑ رہا تھا۔ میری ہنسی کی آواز سن کر اس نے سگریٹ کو ماچس پر رگڑنا بند کر دیا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ابے احمق، یہ کیا کر رہا ہے۔ تیلی سے سگریٹ جلائی جاتی ہے یا سگریٹ سے تیلی۔''

''اوہ۔'' وہ کچھ جھینپ سا گیا۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا اور پھر اس کی کہی ہوئی بات دہرائی۔ ''کچھ ہونا چاہئے، کچھ ہوتے رہنا چاہئے۔''

وہ اس قسم کی الٹی سیدھی حرکتیں کرنے کا عادی تھا۔ سخت سردی میں ایک ہلکی سی قمیص پہنے اور اس

کے بھی بٹن کھولے گھومتا۔ سخت گرمی میں سوٹ چڑھائے نظر آتا۔ کبھی ہاتھ میں سکھوں کی طرح لوہے کا کڑا ڈال لیتا، بال بڑھانے پر آتا تو انہیں شانوں پر پہنچا دیتا اور کٹوانے پر آتا تو سر انڈے کی طرح چمکتا دکھائی دیتا۔ اللہ کی یاد آتی تو ہر وقت مسجد، ہر وقت نماز، ہر وقت وعظ، موڈ بدلتا تو کس کا اللہ، کیسی نماز۔ ایک ہاتھ میں وہسکی کا گلاس، دوسرے ہاتھ میں مینائے شباب اور سامنے کباب۔ مجھ سے ملنا ہوتا تو ایک دن میں دو دو بار ملتا، نہ ملنا ہوتا تو مہینوں شکل نہ دکھاتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ یہ سب کچھ جان بوجھ کر کرتا تھا یا واقعی اس کے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا تھا۔

میں ٹرے اُٹھا کر کمرے میں آیا، میری بیوی لحاف اوڑھے، ناول کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ میں نے ٹرے باورچی خانے میں رکھی اور واپس کمرے میں آ گیا۔

''تم ابھی تک سوئی نہیں۔'' میں نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا۔

''وہ گئے نہیں۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، بیٹھا ہے۔''

''کیا یہیں سوئیں گے؟''

''خدا بہتر جانتا ہے۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔

''کامنی گھر پر تنہا ہوگی!'' ایک بیوی دوسری بیوی کیلئے فکرمند تھی۔

''ہاں، ہوگی تو لیکن میں کیا کروں۔ میں اسے دھکے دے کر تو گھر سے نہیں نکال سکتا۔ اسے اپنی بیوی کا خود خیال ہونا چاہئے۔'' میں بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''سارے مرد آپ جیسے کیوں نہیں ہوتے۔ آپ نے تو مجھے کبھی انتظار نہیں کروایا۔'' میری بیوی نے مجھے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

میں ہنستا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ مجھے ہنستا دیکھ کر شاہد نے پوچھا۔

''کیا ہوا؟ کیوں ہنس رہے ہو؟''

''کچھ نہیں، بس ایسے ہی۔'' میں نے لاپروائی سے کہا، پھر ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر نظر ڈالی۔ ''بارش تو بند ہو گئی ہے۔''

urdunovelist.blogspot.com

''کیا بجا ہے؟'' شاہد نے پوچھا۔

''سوا دس۔'' میں دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جانے کے لئے ٹائم پوچھ رہا ہے لیکن جب اس نے اُٹھنے کے بجائے صوفے پر آرام سے پاؤں پھیلا لئے تو میں نے دل ہی دل میں اللہ سے دعا مانگی۔ دعا قبول ہوتے ہوئے، حسب معمول خاصی تاخیر ہوگئی، وہ تقریباً بارہ بجے گھر جانے کے لئے اُٹھا۔

''اس وقت گھر جا کر کیا کرو گے، یہیں سو جاؤ۔'' میں نے جل کر کہا۔

''نہیں یار کامنی انتظار کرتی ہوگی، اب چلنا چاہئے۔'' آخر اسے اپنی بیوی کا خیال آ ہی گیا۔

''اچھا، جیسی تمہاری مرضی۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

اُس طوفانی رات کے بعد، میری کافی عرصے تک شاہد سے ملاقات نہ ہو سکی، پھر ایک دن وہ خود ہی گھر آ پہنچا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ شاہد جو ٹرین تھا اور کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا عادی تھا، ضرور کوئی پروگرام لے کر آیا ہے، اور ہوا بھی یہی۔ وہ لاہور جا رہا تھا۔ سروس اس نے چھوڑ دی تھی۔ اب فلم لائن میں قسمت آزمانے کا ارادہ تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے منع کروں، لاہور نہ جائے۔ فلم لائن میں پڑھے لکھے لوگوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ صرف دھکے کھانے ہیں تو جاؤ، صد بسم اللہ، لیکن میں نے اس سے کچھ نہ کہا۔ اس سے کچھ کہنا بیکار ہی تھا۔ وہ تمام اہم فیصلے تن تنہا کرنے کا عادی تھا۔

''اکیلے جاؤ گے۔'' میں نے پوچھا۔

''نہیں کامنی کو بھی ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

''وہاں کوئی رہنے کا ٹھکانہ ہے؟''

''لاہور میں، میرے ایک رشتے کا کزن رہتا ہے۔ فی الحال وہاں رہوں گا۔''

''جاؤ بھائی۔ خدا تمہیں کامیاب کرے۔ لاہور جائیں گے تو کم از کم فلم کی شوٹنگ دیکھنے کو تو ملے گی۔''

''صرف شوٹنگ۔ ارے یار جس ہیروئن کو کہو گے تمہاری گود میں بٹھا دوں گا۔ بس ذرا جم جاؤں

وہاں جا کر.....''

جمنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ ٹرین تھا اور ٹرین کے مقدر میں ٹھہراؤ نام کی کوئی چیز نہیں، اس کا کام صرف چلتے رہنا ہے۔ شاہد بھی چل رہا تھا۔ بعض اوقات میں یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا تھا کہ شاہد آخر کہاں پہنچ کر رکے گا۔ اکیلا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی، کہیں بھی دھکے کھاتا پھرتا۔ مجھے کامنی کے مستقبل کی فکر تھی۔

دو تین مہینے تک اس کا کوئی خط نہ آیا۔ میری بیوی اکثر اس کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی، اسے کامنی کے حال چال معلوم کرنے کی فکر تھی۔ کامنی میری بیوی کی بہت اچھی دوست بن گئی تھی۔ آخر ایک دن اس کا خط آ پہنچا۔ خدا کا شکر تھا کہ اسے ایک فلم کا کام مل گیا تھا۔ آج کل وہ مکالمے لکھنے میں مصروف تھا۔ خط میں اس کے حوصلے بہت بلند دکھائی دیتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بہت جلد مصنف کی حیثیت سے فلم انڈسٹری پر چھا جائے گا۔ اپنے کزن کا مکان چھوڑ کر اس نے اس کے قریب ہی کوئی اور مکان کرائے پر لے لیا تھا مجھے اور میری بیوی کو لاہور آنے کے لئے لکھا تھا۔ اس خط کے ساتھ ایک خط کامنی کا بھی تھا جو میری بیوی کے نام تھا۔ کامنی نے اپنے خط میں، شاہد سے متعلق ایک دلچسپ واقعہ بھی لکھا تھا۔

''پتہ نہیں، یہ آپ کے دوست کس قسم کے انسان ہیں۔'' میری بیوی نے خط پڑھنے کے بعد کہا۔

''کیوں کیا ہوا؟''۔

''ذرا کامنی کا خط پڑھئے۔'' میری بیوی نے مجھے کامنی کا خط دیتے ہوئے کہا۔

کامنی کا خط پڑھ کر میں بہت دیر تک ہنستا رہا۔ ''واہ بھئی شاہد۔''

آخر ہوا کیا؟ میں بتاتا ہوں کہ شاہد کی سیماب صفتی نے کیا رنگ اختیار کیا۔ وہ اپنی بیوی سے تو پہلے ہی اُکتایا ہوا تھا۔ اب اس کے ہاتھ کے پکائے ہوئے کھانے میں لذت نہیں رہی تھی۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے سالن سے بھری دیگچی اس نے اپنے کزن ساجد کے یہاں بھجوا دی اور ان سے ان کی ہنڈیا منگوا لی۔ کامنی نے اس دن مرغی پکائی تھی جبکہ ساجد کے یہاں مسور کی دال پکی تھی۔ شاہد نے یہ مسور کی دال بڑے مزے لے لے کر کھائی۔ کامنی نے لکھا تھا کہ شاہد کا کزن ساجد بھی شاہد جیسا ہے۔ شاہد جو کچھ کہتا ہے وہ فوراً مان لیتا ہے۔ ایک دن دونوں نے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا، ساجد کی

urdunovelist.blogspot.com

بیوی اور کامنی نے بھی ساتھ چلنے کا اصرار کیا۔ شاہد نے ایک شرط پر دونوں کو لے جانے کا وعدہ کیا کہ کامنی اور ساجد کی بیوی ایک دوسرے کی ساڑھیاں باندھ کر چلیں گی۔ ساجد نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔ اب بیویوں کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی ساڑھیاں باندھ لیں۔ اس دن شاہد نے بقول کامنی کے اسے خاصا تنگ کیا جبکہ سینما ہال میں وہ ہمیشہ ہاتھ باندھ کر بیٹھنے کا عادی تھا۔

پھر ایک دن وہ ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ شاہد کی رگ رگ میں پارہ بھرا ہوا تھا۔ وہ نچلا بیٹھنا جانتا ہی نہ تھا۔ اس کے اندر کا آدمی ہر وقت اس سے کہتا رہتا تھا کہ کچھ ہونا چاہئے، کچھ ہوتے رہنا چاہئے۔ بات سالن کی دیگچیاں بدلنے سے شروع ہوئی، پھر بیویوں کے کپڑے بدلے گئے، اس کے بعد سینما ہال میں کامنی ساجد کے برابر اور ساجد کی بیوی شاہد کے پہلو میں بیٹھنے لگی۔ اور ایک دن جب دونوں کوئی انگلش فلم دیکھ کر گھر لوٹے تو شاہد ساجد کی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے گھر لے آیا اور کامنی ساجد کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی۔

یہ اخلاق سوز واقعہ شاہد نے مجھے لکھا۔ یہ واقعہ اس نے بڑے مزے لے لے کر بیان کیا تھا۔ خط پڑھتے ہی میرے تو آگ لگ گئی۔ میں نے اسی وقت قسم کھائی کہ آج کے بعد سے ایسے بے حیا آدمی سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا۔ میں نے فوراً اسے خط لکھا، خوب جی بھر کے لعن طعن کی اور آخر میں دوستی ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس خط کے جواب میں شاہد نے کچھ نہ لکھا۔ اس نے مکمل خاموشی اختیار کر لی۔ البتہ کامنی کے خطوط کبھی کبھی میری بیوی کے پاس آتے رہے جس سے حالات کا پتہ چلتا رہا۔

ایک ڈیڑھ سال میں شاہد نے خاصی ترقی کر لی۔ اس کی دو فلمیں کافی مقبول ہوئیں۔ یہ فلمیں میں نے بھی دیکھیں مجھے ذرا اچھی نہ لگیں۔ عامیانہ کہانی، عامیانہ مکالمے اور عریاں رقصوں کے سوا اس میں کچھ نہ تھا۔ میری پسند یا ناپسند ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کی فلمیں پبلک کو پسند آئیں اور یوں آناً فاناً شاہد کے دام بڑھ گئے۔ اب وہ بہت سی فلموں کے لئے کہانی و مکالمے لکھ رہا تھا اور دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہا تھا۔ اس نے گلبرگ میں ایک کوٹھی خرید لی تھی۔ گاڑی وہ پہلے ہی لے چکا تھا۔ یوں اس کے شب و روز عیش میں گزر رہے تھے۔ کامنی کے خط سے ایک اور نئی بات معلوم

ہوئی تھی کہ شاہد نے شراب و شباب کی دنیا میں رہتے ہوئے شراب چھوڑ دی تھی۔ مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کیونکہ شاہد بے تحاشا پینے والے لوگوں میں سے تھا۔ اب تو وہ ایسے ماحول میں پہنچ گیا تھا جہاں قدم قدم پر شراب کے جام ملتے تھے۔ اس نے نہ صرف شراب چھوڑ دی تھی بلکہ سگریٹ نوشی سے بھی توبہ کر لی تھی اور اس کی وجہ ڈاکٹر کی ہدایات نہ تھی بلکہ اس کے اندر کا آدمی تھا جو سخت سردی میں اسے کھلے گریبان کی قمیص اور سخت گرمی میں سوٹ پہننے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اب کیونکہ چاروں طرف ماحول شراب و شباب کا تھا اس لئے خود کو نمایاں کرنے کیلئے ضروری تھا کہ وہ شراب اور سگریٹ سے ہاتھ کھینچ لے تاکہ لوگ اس کے بارے میں سنیں تو حیرت زدہ رہ جائیں۔ کافی عرصے کے بعد مجھے اس کا ایک خط ملا۔ میرے نام یہ اس کا آخری خط تھا۔ لکھا تھا۔

پیارے!

تم مجھ سے ناراض ہو، قطع تعلق کر بیٹھے ہو، لیکن میں تمہیں کل بھی دوست کہتا تھا۔ آج بھی تم میرے دوست ہو۔ میں مر جاؤں گا تو یاد کرو گے۔ میں ٹرین ضرور ہوں لیکن اب چلتے چلتے تھک گیا ہوں یا شاید میں چلنے کی یکسانیت سے اُکتا گیا ہوں۔ زندگی تو تبدیلیوں کا نام ہے۔ بس کچھ ہونا چاہئے، کچھ ہوتے رہنا چاہئے۔ اگر میری موت کی خبر تم تک پہنچے تو تم فوراً لاہور آ جانا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کتبہ تمہارے ہاتھوں میری قبر پر نصیب ہو جسے میں نے سنگ مرمر پر لکھوایا ہے۔ کیا میں اُمید رکھوں کہ تم میری اس وصیت پر عمل کرو گے۔ پیارے اس دنیا میں تمہارے سوا میرا کوئی نہیں۔

تمہارا: شاہد

میں اس خط سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ اس قسم کی چونکا دینے والی باتیں وہ اکثر کرتا رہتا تھا، میں کہاں تک متاثر ہوتا۔ میں نے اس اوٹ پٹانگ خط کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

ٹھیک دس دن بعد مجھے شاہد کی موت کی اطلاع ملی۔ کامنی کا ٹیلی گرام پڑھ کر مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ یقین نہ آیا کہ شاہد مر چکا ہے۔ میں اس خط کو ایک غیر سنجیدہ حرکت ہی سمجھا تھا۔ کامنی نے مجھے فوراً بلایا

urdunovelist.blogspot.com

تھا۔ میری عجیب حالت تھی۔ شاہد کیسا بھی سہی پر میرا دوست تھا۔ سب سے پرانا دوست، میں نے جلدی جلدی لاہور جانے کی تیاری کی اور اپنی بیوی کو لے کر ہوائی جہاز کے ذریعے لاہور پہنچا۔

کامنی میری بیوی کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئی۔ میں بے اختیار شاہد کی میت کی طرف بڑھا۔ میرا دوست کفن میں لپٹا ہوا تھا۔ میں نے اس کے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور اسے آہستہ سے سلام کیا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ میں نے شاہد کو سلام کیوں کیا تھا۔ بس اسے ایک اضطراری حرکت کہہ لیں۔ شاہد گہری نیند میں تھا اس کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ میں اسے بہت دیر تک یوں ہی دیکھتا رہا۔ پھر کسی نے مجھے اس کے پاس سے ہٹالیا اور اس کا چہرہ کفن سے ڈھک دیا۔

شاہد کی موت، خواب آور گولیوں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس نے پوری شیشی حلق میں اُلٹ لی تھی۔ سب پریشان تھے کہ آخر شاہد نے خودکشی کیوں کی؟ کسی کے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا، شاید وہ جینے کی یکسانیت سے اُکتا گیا تھا۔

شاہد کو میں نے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارا۔ پھر اس کی وصیت کے مطابق، کتبہ بھی اس کی قبر پر لگایا۔ میری آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

تب ہی کسی نے زور سے میرا کندھا ہلایا۔ میں نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے کندھا ہلانے والے کو دیکھا۔ وہ بڑی حیرت سے سنگ مرمر کی سل کو دیکھ رہا تھا۔

''ارے، یہ کیسا کتبہ ہے۔ اس پر تو کچھ بھی نہیں لکھا۔''

پھر جب میں نے آنکھوں سے آنسو صاف کر کے کتبے پر نظر ڈالی تو خود بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ کتبے کے نام پر بنائی گئی اس سنگ مرمر کی خوبصورت سی سل پر واقعی کچھ نہ لکھا تھا۔ شاہد جاتے جاتے ایک اور جھٹکا دے گیا تھا۔ □□

شیر خوار

صبح دم جب چمپا کے سونے آنگن میں وہ ننھی سی چیخ گونجی تو چمپا کی ساس خوشی سے دیوانی ہوگئی۔ وہ دالان میں بڑے سے طاق پر رکھی ہوئی کرشن بھگوان کی مورتی کے سامنے جھک گئی اور بہت دیر تک جھکی ہوئی اپنے کرشن بھگوان سے جانے کیا کیا کہتی رہی۔ کرشن جی ہاتھوں میں مرلی لئے، ہونٹوں پر مدھر مسکان سجائے اس کی سنتے رہے..... اور کیا کرتے۔

معاً چمپا کی ساس کو منگل کا خیال آیا۔

ارے منگل کدھر غائب ہوگیا۔ ابھی تو وہ آنگن میں ٹہل ٹہل کر بچے کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ شاید تھک کر سو گیا۔ وہ تیزی سے کوٹھری کی طرف دوڑی۔ کوٹھری میں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ اٹکل سے اس کی چارپائی تک پہنچ گئی اور منگل کو جھنجھوڑ ڈالا۔

''اٹھ رے منگل۔''

''کیا ہوا ماں۔'' وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ گیا۔

''ارے ماں کے بچے۔ تو باپ بن گیا۔ بھگوان نے بیٹا دیا ہے تجھے۔''

''بیٹا۔'' منگل کے دل میں انار چھوٹنے لگے۔

اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر ماں کا ہاتھ پکڑا اور پھر اس سے لپٹتے ہوئے بولا۔

urdunovelist.blogspot.com

''دیکھ ماں۔ اب میرے اوپر ہاتھ نہ اٹھانا۔ میں باپ بن گیا ہوں۔ اوہ کتنے مزے کی بات ہے۔''

''اچھا، اب زیادہ مسخری نہ کر۔ جا کے چمپا کو دیکھ، اپنے بیٹے کو چوم چاٹ..... کھاٹ چھوڑ۔ میں ذرا کمر سیدھی کرلوں۔ بوٹی بوٹی دکھ رہی ہے۔'' منگل کی ماں پسرتے ہوئے بولی۔

''لے ماں تو آرام کر، میں چلتا ہوں۔''

منگل نے چارپائی سے اٹھ کر ایک بھرپور انگڑائی لی اور پھر بن پیئے جھومتا ہوا چمپا کی طرف چلا۔ لالٹین کی ملگجی روشنی میں منگل کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر چمپا سٹپٹا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ لجائے شرمائے یا بے حیائی سے اپنے شوہر کے گلے میں بانہیں ڈال دے۔

جب منگل میٹھی نظروں سے دیکھتا ہوا اس کے چہرے پر جھکا تو وہ بری طرح شرما گئی۔ اس نے جلدی سے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

''اب تجھے کیا کہوں، چمپا یا منے کی ماں۔'' منگل نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے شرارت سے دبایا۔

''چل ہٹ۔'' چمپا نے اسے پرے دھکیل دیا۔ پھر اپنے بچے سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''آنکھیں کھول رے منے۔ دیکھ تیرا باپ آیا ہے۔ یہ بہت دن سے ہائے بچہ، ہائے بچہ کر رہا تھا۔''

''اوہو..... جیسے تجھے تو بچے کی خواہش ہی نہ تھی۔'' منگل منے کے بجائے سیدھا اس سے مخاطب ہوا۔

''یہ دنیا بھر کے ٹونے، ٹوٹکے کون کرتا پھرتا تھا۔ میں کہ تو..... اور وہ پریوار نیوجن کی ڈاکٹرنی کے پاس کون گیا تھا۔ ڈاکٹرنی جی مجھے بانجھ پن دور کرنے کی دوائی دے دو۔ پریوار نیوجن والے تو پہلے ہی بچوں کے بیری ہیں۔ وہ تجھے بانجھ پن دور کرنے کی دوائی ضرور دیتے۔ ڈاکٹرنی کیسی ہنسی تھی یہ سنکر۔'' منگل نے اسے چھیڑا۔

''دیکھ رے منے۔ اپنے باپ کو سمجھا لے۔ یہ پرانی باتیں نہ اکھاڑے۔'' چمپا براہ راست اس سے مخاطب ہونے کو تیار نہ تھی۔

''نہیں منے، تو اس کی بات بالکل نہ ماننا، تو میرا بیٹا ہے میرا۔''

''ٹھینگا ہے یہ تیرا بیٹا۔ میں اسے سنبھال سنبھال کر نڈھال ہوگئی۔ اب آ گیا اپنا حق جتانے، میرا بیٹا ہے میرا، مفت خور۔'' چمپا نے منہ چڑایا۔

ممکن تھا کہ یہ جھگڑا طول پکڑتا مگر بچے کو ان کی لڑائی اچھی نہ لگی اس نے اکتا کر رونا شروع کر دیا۔ دونوں جھگڑا بھول کر اس کی دلجوئی میں لگ گئے۔

پورے سات سال بعد چمپا کے دل کی کلی مسکائی تھی۔ بچے کیلئے اس نے کیا کیا جتن نہ کئے تھے، پیر فقیر، سادھو سنت، وید حکیم، گنڈے تعویذ، ٹونے ٹوٹکے، جھاڑ پھونک، سب ہی کچھ تو اس نے آزما ڈالا تھا۔

پر کیا ہوا؟

کچھ نہیں۔ ساری محنت اکارت گئی۔

پھر یوں ہی بیٹھے بٹھائے بھگوان نے اس کی گود ہری کر دی اور جب دینے پر آیا تو بیٹی کی جگہ بیٹا بخش دیا حالانکہ چمپا کی خواہش تھی۔ ''بھگوان تو بیٹا نہیں دے سکتا تو بیٹی ہی دے دے، میری خالی کوکھ میں کچھ تو ڈال۔''

بھگوان کی لیلا نرالی ہے۔ جب دینے پر آتا ہے تو چھپڑ پھاڑ کر دیتا ہے اور نہ دینے پر آئے تو ہری بھری گود اجاڑ دیتا ہے کوئی اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔

بچے کی آمد پر پورا گھر خوش تھا گھر میں تھے ہی کتنے افراد؟ ایک منگل، ایک منگل کی ماں، چمپا اور وہ نوزائیدہ۔ بچے کے لئے ترسی ہوئی چمپا اپنے بچے سے جتنی محبت کرتی کم تھا لیکن چمپا کی ساس کو اپنے پوتے سے ضرورت سے زیادہ محبت تھی۔ وہ ہر وقت اس پر واری نیاری ہونے کو تیار رہتی۔ گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتی۔ منٹ منٹ پر نظر اتارتی، بچہ روتا تو تڑپ جاتی۔ کبھی اسے بھگوت گیتا کا پاٹھ سناتی۔ چمپا اپنی ساس کو گیتا کا پاٹھ سناتے دیکھتی تو بہت ہنستی۔ یہ دو دن کا بچہ گیتا کو کیا سمجھے گا لیکن ماں اسے ابھی سے سادھو سنت بنانے پر تلی ہوئی ہے۔ اپنے منگل کو تو کچھ نہ بنا سکی۔ وہ چرسی کا چرسی ہی رہا۔ یہ آج کل کی اولاد ضرور اس کے کہنے میں چلے گی۔

منگل ایک سرکاری محکمے میں چپراسی تھا۔ نہایت حرام خور اور کام چور۔ چھٹی پر چھٹی لینا، چرس پی کر گھر پڑے رہنا۔ نوگوٹی کھیلنا، کتوں کی طرح مارے پھرنا، کبھی گندے بازاروں میں جا کر منہ کالا

urdunovelist.blogspot.com

کرنا، یہ سب اس کے محبوب مشاغل تھے۔ ساری تنخواہ چھٹیوں میں کٹ جاتی، جو دس پانچ روپے ملتے وہ چرس اور نوگوٹی کی نذر ہو جاتے۔

پہلی تاریخ کو چمپا بڑے شوق سے اپنے شوہر کا انتظار کرتی۔ یہ ہمیشہ کی طرح لٹ پٹ کر گھر میں داخل ہوتا۔ چمپا تھانیدار کی طرح اس کی تلاشی لیتی۔ جب جیب اور لپٹی ہوئی آستینوں سے کچھ نہ نکلتا تو مہابھارت چھڑ جاتی اور اس وقت تک چھڑی رہتی جب تک منگل اس کی پٹائی نہ کر دیتا۔ چمپا پٹ پٹا کر اپنا غصہ ساس پر نکالتی۔

''دیکھ ماں۔ اس کو سمجھا لے۔ اب بھی سیدھے راستے پر آ جائے ورنہ میں اسے کھا جاؤں گی۔''

''ارے کیا کھرابی ہے میرے بیٹے میں، شراب پیتا ہے، جوا کھیلتا ہے، کوئی عورت رکھی ہوئی اس نے، بول۔''

''نہیں تو...... تیرا بیٹا تو بڑا سادھو سنت ہے، پھر یہ تنکھا کہاں جاتی ہے۔ اب تو بول۔''

''جاتی کہاں ہے، چھٹیوں میں کٹ جاتی ہے، ہر سمے اسے کولہے سے لگا کر بیٹھے گی تو یہی ہوگا۔''

''دیکھ ماں تو ہوش کی باتیں کر۔ میں روکتی ہوں اسے کام پر جانے سے۔ یہ آپ ہی چرس پی کر مجھ سے جونک کی طرح چمٹ جاتا ہے۔ میں تو دھکے دے دے کر تھک جاتی ہوں۔''

''پھر تو جان اور تیرا پتی۔''

''ماں، پھر گھر کیسے چلے گا۔''

''جیسے اب تک چل رہا ہے میں سوت کاتوں گی تو رسی بٹے گی اور منگل پڑا اپڑا کھاٹ توڑے گا۔ لا اپنی جوتی تو اٹھا۔''

یہ سنتے ہی چمپا بجلی کی تیزی سے اپنا جوتا ساس کے ہاتھ میں تھما دیتی اور پھر چمپا کا جوتا ہوتا، ماں کا ہاتھ اور منگل کا سر، وہ سر جھکائے پٹتا رہتا اور موقع ملتے ہی دروازے سے چھلانگ لگا کر باہر غائب ہو جاتا۔

اور چمپا اپنے جسم کے زخم بھول کر مسکرا اٹھتی۔

بچہ ہونے کے بعد تو جیسے ایک معقول بہانہ منگل کے ہاتھ آ گیا تھا۔ سات سال بعد بچے کی

صورت دیکھنی نصیب ہوئی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر کس طرح دفتر جا سکتا تھا۔ وہ اپنے بچے کو ایک لمحے کیلئے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتا تھا، چمپا اسے دھکیل دھکیل کر دفتر بھیجتی مگر وہ ادھر ادھر گھوم پھر کر گھر میں گھس آتا۔ چمپا اس کی صورت دیکھتے ہی پریشان ہو جاتی اور بچے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیتی۔ اسے دبوچ لیتی مگر منگل کہاں مانتا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے بچے کو اس سے چھین لیتا، چمپا تڑپ اٹھتی۔

''دیکھ ماں...... اپنے بیٹے کو سمجھا لے۔ اس نے مجھے بہت تنگ کر رکھا ہے کسی طرح مانتا ہی نہیں۔'' وہ اپنی ساس سے شکایت کرتی۔

''ارے کیا کھرابی ہے میرے بیٹے میں، شراب پیتا ہے جوا کھیلتا ہے، کوئی عورت رکھی ہوئی اس نے، بول۔'' منگل کی ماں ہمیشہ کی طرح شکایت کے جواب میں ایک ہی بات کہتی۔

یہ سن کر چمپا دل مسوس کر رہ جاتی۔ نہیں ماں تیرے بیٹے میں جو خرابی ہے، وہ تو نہیں جانتی۔ کوئی بھی نہیں جانتا۔ پر میں اپنے زخم کس کو دکھاؤں۔ کہاں جاؤں۔ اس کے سامنے اندھیرا پھیل جاتا۔

شروع شروع میں تو بچہ سوتا رہتا تھا یا آنکھیں کھولے چپ چاپ پڑا رہتا تھا لیکن اب وہی ہنس مکھ بچہ دن بہ دن چڑچڑا ہوتا جا رہا تھا۔ دن بھر روتا رہتا چمپا اسے ہلاتے ہلاتے تھک جاتی مگر وہ چپ ہونے کا نام نہ لیتا۔

''اری، اسے دودھ پلایا یوں ہی ہلائے جا رہی ہے۔'' منگل کی ماں بچے کو روتا دیکھ کر چمپا کو ڈانٹتی۔

''پلا دیا ماں...... میری چھاتی میں جتنا دودھ تھا سب پلا دیا۔''

''پھر یہ کیوں رو رہا ہے۔''

''بھوکا ہے اس لئے۔''

''ارے۔ تو اسے گئو ماتا کا دودھ لے کر پلا دے نا۔'' چمپا کی ساس جھنجھلا جاتی۔ ''آج کل کی ماؤں کی چھاتیوں میں تو جیسے دودھ سوکھ گیا۔''

''کھانے کو پیسے نہیں۔ روز روز دودھ کیلئے پیسے کہاں سے آئیں گے۔''

''تو پھر اسے بھوکا مارے گی کیا؟''

''اگر اس کے بھاگیہ میں بھوک سے مرنا لکھا ہے تو کون روک سکتا ہے۔''

urdunovelist.blogspot.com

یہ کہہ کر چمپا رو پڑی خوب بلک بلک کر روئی جیسے سچ مچ اس کا بچہ مر گیا ہو۔

☆.....☆.....☆

''بی بی.....سال ڈیڑھ سال پہلے میں تمہارے پاس بانجھ پن دور کرنے کی دوا لینے آئی تھی تو تم ہنس پڑی تھیں، لیکن آج میں بانجھ ہونے آئی ہوں۔ مجھے لوپ لگوا دو۔ اب مجھے بچوں کی ضرورت نہیں۔'' چمپا کے لہجے میں تلخی تھی۔

فیملی پلاننگ سینٹر کی لیڈی ڈاکٹر شکنتلا فوراً ہی چمپا کو پہچان گئی۔ اس نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''کتنے بچے ہیں تمہارے۔''

''ایک۔'' چمپا بڑی افسردگی سے بولی۔

''میں سمجھی شاید تم نے ایک ساتھ دو تین بچوں کو جنم دے دیا ہے۔'' شکنتلا مسکراتے ہوئے بولی۔ ''پھر تم لوپ کیوں لگوانا چاہتی ہو، ایک دو بچے اور ہو جانے دو ابھی۔''

''نہیں، بی بی۔ مجھے بانجھ بنا دو۔ مجھے اب بچہ نہیں چاہئے۔'' وہ سر پٹکنے لگی۔

''لیکن کیوں؟''

''میں اپنے بچوں کو بھوکا نہیں مارنا چاہتی۔'' وہ بے حد اُداس تھی۔ ''اس بچے کو ہی دودھ نہیں ملتا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ جئے کہ مرے..... پھر جانتے بوجھتے دوسرے بچوں کی ہتھیا کیوں کراؤں۔''

''تم اپنے بچے کو دودھ کیوں نہیں پلاتیں۔''

''میں کس کس کو دودھ پلاؤں، بی بی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''کیا مطلب؟'' ڈاکٹر شکنتلا چکرا گئی۔

چمپا نے فوراً ہی جواب نہ دیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے لیڈی ڈاکٹر شکنتلا کو دیکھتی رہی، بالکل پاگلوں کی طرح۔ پھر دھیرے سے بولی۔ ''میرا آدمی بڑا کھراب ہے بی بی۔'' □□

ڈھکوسلہ

آج جمعرات تھی۔ اور ہر جمعرات کی طرح ڈگری شاہ کے مزار پر آج بھی بھیڑ تھی۔ اس بھیڑ میں عورتیں بھی تھیں مرد بھی تھے..... کوئی فاتحہ پڑھنے آیا تھا تو کوئی چادر یا بتاشے چڑھانے، کوئی منت ماننے آیا تھا تو کوئی تاک جھانک کرنے۔

اس وقت ڈگری شاہ کے مزار کی رونق عروج پر تھی سب اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔

کچھ غنڈے اور بے فکرے، اس تنگ پل پر کھڑے تھے اور بار بار اپنا ہاتھ کسی لڑکی کے جسم سے ٹکرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ فقرے چست کر رہے تھے۔ کچھ معنی خیز انداز میں کھانس رہے تھے حالانکہ پل کے قدموں میں ہی پولیس چوکی تھی اور نیچے ڈگری شاہ کا مزار۔

مزار کے سامنے کچھ ہیر و قسم کے لڑکے کھڑے تھے جو بال سنوار سنوار کر لڑکیوں کو گھور رہے تھے..... کچھ بچے بھی تھے جو مزار سے نکلنے والے ہر شخص سے مکھیوں کی طرح چمٹ جاتے تھے اور بتاشے لے کر ہی ہٹتے تھے کسی عورت کے ہاتھ میں بتاشے دیکھ کر، کبھی جوان بھی اُن میں شامل ہو جاتے تھے۔

مزار کے اندر کچھ جوان لڑکیاں دیوار کا سہارا لئے کھڑی تھیں اور نقاب کھولے باہر کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کی مائیں یہ دعائیں کر رہی تھیں۔ ''اے ڈگری شاہ! میری لڑکی پر اپنا سایہ رکھنا، اس کو نیک راہ پر چلانا، بدی سے بچانا اور اس کی جلدی سے کہیں شادی کرانا۔''

urdunovelist.blogspot.com

کچھ طوائفیں یوں دعا کر رہی تھیں۔ ''اگر میرے گاہکوں میں اضافہ ہو گیا تو میں ایک ریشم کی چادر چڑھاؤں گی۔''

ایک دھوتی پوش، ادھیڑ عمر ہندو عورت ڈگری شاہ کے پیر دبا رہی تھی۔ کئی عورتیں اور مرد اس انتظار میں کھڑے تھے کہ کب یہ ہٹے اور کب ہمیں پیر دبانے کا موقع ملے۔ مگر عورت تھی کہ ہٹنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ کبھی قبر کے اس کونے کو کبھی دوسرے کونے کو چادر کے اوپر سے آہستہ آہستہ دبا رہی تھی..... وہ پیر دباتی رہی۔ اور پیر دبانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔

''اے مائی اٹھو نا..... دوسروں کو بھی موقع دو۔''

آخر مزار کے ایک نگراں کو بھیڑ جمع دیکھ کر صبر نہ ہو سکا۔ اس نے ٹوک ہی دیا۔

وہ آنسو پونچھتی ہوئی اُٹھ گئی۔ اس کے اُٹھتے ہی کئی عورتیں ایک ساتھ قبر پر ٹوٹ پڑیں، وہ پیر دبانے میں ایسی مشغول ہوئیں کہ انہیں اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ رہا۔ ان عورتوں کے درمیان ایک مرد پھنسا ہوا تھا جو بڑے مزے سے پیر دبا رہا تھا۔

ایک کونے میں مزار کا خادم بیٹھا تھا جو بتاشوں پر جلد جلد فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ چند سیکنڈ اس کے ہونٹ ہلتے دکھائی دیتے تھے..... خدا جانے وہ فاتحہ پڑھ رہا تھا یا گالیاں دے کر آدھے بتاشے واپس کر رہا تھا، آدھے بتاشے وہ نذرانے کے طور پر لے رہا تھا۔

اچانک ایک کار مزار کے سامنے آ کر رکی۔

اور اس میں سے ایک شخص اُترا..... بھرے بھرے چہرے پر کالی داڑھی، سر پر عمامہ، کانوں میں بڑے بڑے بالے، جسم پر مخملی چغہ، پیروں میں سلیم شاہی جوتے۔ ان سب چیزوں نے اس کی شخصیت کو بارعب بنا دیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا مزار کی طرف بڑھا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ لوگوں نے مزار کا دروازہ چھوڑ دیا اور ادھر ادھر کھڑے ہو گئے، ان کے درمیان ایک تنگ راستہ بن گیا جس سے وہ گزرنے لگا۔

''یہ کون ہیں۔'' کہانی کار نے اپنے پاس کھڑے ہوئے آدمی سے پوچھا۔

''یہ میاں ہیں۔'' اس نے سرگوشی کی۔

''میاں تو عورتوں کے ہوتے ہیں۔'' کہانی کار نے مذاق اُڑایا۔

''شش..... ایسا نہ کہو یہ بڑے پہنچے ہوئے میاں ہیں۔''

''اچھا!'' کہانی کار نے حیرت ظاہر کی۔

''ہاں..... انہوں نے ہی تو ڈگری شاہ کا اتنا اچھا مزار بنوایا ہے اور یہی ہر سال یہاں عرس کراتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

کہانی کار بغیر کچھ جواب دیئے آگے بڑھ گیا۔ یہ دیکھنے کیلئے مزار کے اندر وہ کیا کر رہا ہے۔

کہانی کار نے جالیوں میں سے اندر جھانکا تو حیران رہ گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ شخص سجدے میں پڑا بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا ہے۔ وہ کچھ دیر یوں ہی روتا رہا۔ پھر اُٹھا آنسو پونچھے اور دعا کے انداز میں ہاتھ اُٹھا دیئے۔ اس کے ہونٹ ہلتے رہے اور چند سیکنڈ بعد اس کے ہونٹ ہلنے بند ہو گئے۔ پھر وہ باہر کی طرف بڑھا۔

اسے باہر آتا دیکھ کر لوگوں نے پھر اس کے لئے جگہ چھوڑ دی۔ ایک تنگ راستہ کا رتک بن گیا۔

کار میں بیٹھتے ہی اسے معلوم ہو گیا کہ کوئی دوسرا آدمی بھی اس کے بغل میں آ بیٹھا ہے۔ مگر وہ خاموش رہا۔ کار اسٹارٹ ہوئی۔

☆.....☆.....☆

''ہم آٹھ سال بعد مل رہے ہیں۔'' آخر کہانی کار نے خاموشی کے دل میں چھرا گھونپا۔

''ہاں۔'' مختصر سا جواب ملا۔

''تو تم مجھے پہچان گئے۔'' کہانی کار کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں..... اپنے جگری دوست کو کون بھول سکتا ہے۔'' وہ بولا

''یہ سب کیا ڈھکوسلہ ہے؟''

''کون سا ڈھکوسلہ۔''

''یہی ڈگری شاہ۔''

''ڈگری شاہ ایک بزرگ تھے۔''

''تمہارا ان سے کیا تعلق تھا؟''

urdunovelist.blogspot.com

''میں ان کا مرید تھا۔''

''پھر۔''

''وہ انتقال فرما گئے۔''

''اور تم نے مزار بنوا دیا۔''

''ہاں۔''

''تم کیا کرتے ہو۔'' سوال ہوا۔

''کچھ نہیں..... اپنے پیر کی یاد میں کھویا رہتا ہوں۔'' جواب ملا۔

''یہ بہترین لباس اور کار کہاں سے آئی۔'' کہانی کار نے پوچھا۔

''یہ سب ڈگری شاہ کی دین ہے۔'' اُس نے بتایا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو..... سچ سچ بتاؤ۔''

''سچ سچ بتاؤں؟ سچ بڑا تلخ ہوتا ہے۔ کیا تم سچ برداشت کر سکو گے؟''

''ہاں۔'' کہانی کار نے کہا۔

''سنو۔'' وہ بولا۔

تب کار نے ایک طویل موڑ لیا اور پھر سیدھی چلنے لگی۔

''یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ بی اے میں نے تمہارے ساتھ کیا تھا۔''

''ہاں مجھے یاد ہے۔''

''بی اے کرنے کے بعد کیونکہ میرے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ آگے تعلیم جاری رکھتا..... اس لئے میں نے نوکری کے لئے درخواستیں بھیجنی شروع کر دیں، مگر کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے دفتروں میں چکر کاٹنے شروع کر دیئے، چپلیں گھس گئیں، مگر نوکری نہ ملی۔

اس غم میں میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس بھری دنیا میں تنہا رہ گیا، اپنے شہر کو چھوڑا، دوسرے شہروں کی خاک چھانتا پھرا۔ لیکن نوکری نہ ملی، شاید میری قسمت میں خدا نوکری کا خانہ پر کرنا بھول گیا تھا..... کئی دفعہ سوچا خودکشی کر لوں۔ کئی دفعہ خیال آیا، بھیک مانگنے لگوں، مگر یہ دونوں ذلیل کام تھے۔ ایک خدا کی نظر میں اور دوسرا دنیا کی نگاہ میں۔''

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ سوچنے کے انداز میں اس نے انگلیوں کو پیشانی پر رگڑا اور پھر بولا۔

''ایک دن میں پل کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ اچانک میرے دماغ میں ایک ترکیب کوندی۔ ترکیب بڑی شاندار تھی۔ میں نے اسی رات اس پر عمل کرنے کی ٹھانی۔

دوسرے دن جب لوگوں نے پل کے نیچے ایک قبر بنی دیکھی تو حیرت میں پڑ گئے۔ میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ میں رات کو پل سے گزر رہا تھا کہ نیچے ایک بزرگ نظر آئے۔ وہ اوپر سے نیچے تک سفید لباس میں لپٹے ہوئے تھے اور سفید داڑھی تھی۔ چہرے پر نور تھا۔ میں نے کوئی جن ون جان کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ ابھی دس قدم نہ چل پایا تھا کہ کسی نے میری بانہیں تھام لیں۔ آنکھیں کھلیں تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ سامنے وہی بزرگ کھڑے تھے۔

''تم میرا ایک کام کر دو گے۔'' بزرگ نے پوچھا۔

''کک..... کیسا کام؟'' میں کانپ گیا۔

''دیکھو..... میری قبر مٹ گئی ہے..... تم اس پر مٹی چڑھا سکتے ہو۔''

''کہاں ہے آپ کی قبر؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ نیچے جہاں میں ابھی کھڑا تھا۔'' انہوں نے بتایا۔

''جی..... چڑھا دوں گا۔''

''ایک بات اور..... میری قبر پر ہر جمعرات کو روشنی کیا کرنا۔'' ابھی میں کچھ کہہ نہ پایا تھا کہ وہ غائب ہو گئے۔

یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ لوگ ہر جمعرات کو چراغ جلانے آنے لگے۔ پھر پھول چڑھنے لگے، چادریں چڑھنے لگیں اور لوگ منت ماننے لگے۔ میں نے اپنا چولا بدلا۔ چہرے پر داڑھی رکھی اور دن رات مزار پر رہنے لگا۔ مزار پر آئے ہوئے نذرانوں کو فروخت کر دیتا۔ کھانے کے پیسے نکال کر سارا روپیہ مزار کی بناوٹ اور سجاوٹ میں لگا دیتا۔

دو سال کے اندر ہی میں نے مزار کو بہت خوبصورت بنا دیا۔ مزار کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ آمدنی بھی بڑھنے لگی۔ میں نے مزار کے چاروں کونوں میں ڈبے رکھوا دیئے جن میں لوگوں نے پیسے ڈالنے شروع کر دیئے۔ اب یہ ساری آمدنی میری جیب میں جاتی ہے اور میں عیش کرتا ہوں۔''

urdunovelist.blogspot.com

یہ کہہ کر اُس نے ڈھٹائی سے قہقہہ لگایا۔

''ایک بات اور بتاؤ۔'' کہانی کار نے پوچھا۔

''پوچھو۔''

''تم نے اس مزار کو ڈگری شاہ کا نام کیوں دیا۔''

جانے اس سوال میں ایسی کیا بات تھی کہ یکا یک اُس کے سرخ سفید چہرے پر مردنی چھا گئی۔ اُس کے جسم پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ اُس نے فوراً گاڑی روک لی اور کہانی کار کی طرف آنسو بھری نظروں سے دیکھا اور پھر اسٹیئرنگ پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے سر اُٹھایا اور کربناک لہجے میں بولا۔ ''اس قبر میں میری بی اے کی ڈگری دفن ہے۔'' □□

پوری عورت

ایک جھٹکے سے اس نے قلم بند کیا اور فائل پھینک کر وہ اُٹھنا ہی چاہتا تھا کہ رُک گیا۔ دفتر کی بدنما کھڑکی سے باہر کا خوشگوار موسم صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے موسم پر نہ جانے وہ کیوں جان دیتا تھا۔ جنوری کی آخری تاریخیں تھیں کڑاکے کی سخت سردی، خون رگوں میں منجمد ہو رہا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل، دودھ پر دبیز ملائی کی طرح چڑھے ہوئے تھے۔ تیز ٹھنڈی ہوا لحاف کا پتہ پوچھتی پھر رہی تھی اور سورج بادلوں کے فریج میں یخ ہو گیا تھا۔

اور عمران کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ دفتر کے دیمک زدہ ماحول سے نکلے۔ بادلوں کے سائے تلے، کھلی فضا اور ٹھنڈی ہوا میں سانس لے۔ کوٹ اُتارے، قمیص کے کالر سے ٹائی کھینچے اور قمیص کے بٹن کھول کر بالوں سے بھرے سینے کو ننگا کر دے اور ہوا میں اُڑتا پھرے۔

عمران نے جلدی جلدی فائلوں اور بکھرے ہوئے کاغذات کو سمیٹا۔ اور انہیں لکڑی کی الماری میں ڈال کر جب اس نے زور سے الماری کے پٹ بند کئے تو اس کی آواز سے اَپر ڈویژن کلرک ملک امین چونک پڑا۔ اس کی نظر جب عمران کی صفاچٹ میز سے ہوتی ہوئی لکڑی کی الماری تک پہنچی تو عمران الماری میں زنگ آلود تالا ڈال چکا تھا۔

''کیوں باؤ..... کی ہویا؟'' ملک امین نے عینک اُتار کر ایک طرف رکھی۔ اپنے چیچک زدہ چہرے

urdunovelist.blogspot.com

پر گڑ میں سنی مسکراہٹ پھیلا کر عمران کا فیصلہ سننے کے لئے تیار ہو گیا۔

لوئر ڈویژن کلرک عمران صدیقی نے الماری کی چابی میز پر رکھی۔ یکا یک اسے میز پوش میں ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آ گیا تو اس نے چابی اس سوراخ میں گھسیڑ دی..... میز پر جھکا اور آہستہ سے بولا۔ ''میں جا رہا ہوں۔''

''جاؤ باؤ..... خوشی نال جاؤ۔'' ملک امین نے تیار شدہ ڈرافٹ پر دستخط کر دیئے۔ اسے بس یہی کچھ آتا تھا۔ پھر اپنے سر کو کھجانے لگا، جیسے افسروں کی ڈانٹ کی بجائے آج اس کے سر پر جوتے پڑنے والے ہوں۔

دفتر کی سیلی بساند بھری فضا سے نکل کر، لان پر کھڑے ہو کر اس نے زوردار انگڑائی لی، اور لمبے لمبے سانس لے کر پھیپھڑوں سے ساری گندی ہوا خارج کر دی۔ پھر سائیکل اسٹینڈ کی طرف بڑھا۔

سائیکل کا ہینڈل پکڑ کر پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑا۔ سڑک ہلکی ہلکی بوندا باندی سے گیلی ہو گئی تھی اور اس پر کیچڑ پتلے آٹے کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے جوتے کیچڑ میں بھرنے لگے تو وہ اچھل کر سائیکل پر سوار ہو گیا۔

عمران نے ٹائی ڈھیلی کر کے قمیص کے بٹن کھول دیئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا اس کے سینے کے بالوں کو نوچ رہی تھی، اور وہ مزے میں پیڈل پر پیڈل مارے جا رہا تھا۔ لوگ اسے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ وہ خود اپنی اس حماقت پر اندر ہی اندر ہنس رہا تھا۔ لیکن اسے لوگوں کی پروا نہیں تھی، پروا تو اپنی بھی نہ تھی ..... بس آج اس نے اپنی دیرینہ خواہش کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

جب ایک اسکول کی لڑکی نے اسے دیکھ کر ''پاگل ہے'' کا نعرہ بلند کیا تو اس کی عقل فوراً کھوپڑی میں آ گئی۔ عمران کوشش کے باوجود اس پاگل بنانے والی لڑکی کو نہ دیکھ سکا۔ لڑکیوں کا ایک جھنڈ تھا جو اسکول سے واپس آ رہا تھا اور اس غول میں نہ صرف اس لڑکی کی تلاش مشکل تھی بلکہ ان کی طرف دیکھنا بھی شہد کی مکھیوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دینے کے مترادف تھا۔

آگے اسکول تھا۔ بہت سی لڑکیاں اسے آتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس لئے اس نے سائیکل روکی قمیص کے بٹن بند کئے۔ ٹائی بھی ٹھیک کی، اور پھر چل پڑا۔ اس کی نظر ایک ایک لڑکی کا جائزہ لے رہی تھی اور اب کسی لڑکی میں اس کی گرم گرم آنکھوں سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہ تھی۔

گول مٹول گوری گوری، سرخ سفید، کچوری ایسے گالوں والی لڑکیاں اس کے سامنے سے گزر رہی تھیں اور وہ ہر لڑکی کا نظر کی چھری سے پوسٹ مارٹم کر رہا تھا۔

اب وہ تیزی سے پیڈل مار رہا تھا اور سائیکل ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ایسی سخت سردی میں بھی اس کا جسم اندر کی آگ سے جل اُٹھا تھا اور اس نے طے کر لیا تھا کہ گھر میں گھستے ہی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کمرے میں دھکیل دے گا اور دروازہ بند کر کے نہ تو کمرے سے خود نکلے گا اور نا بیوی ہی کو نکلنے دے گا، یہاں تک کہ صدیاں بیت جائیں گی۔

لبنیٰ نے دروازے پر بارہ بجے کے قریب عمران کو کھڑا پایا تو وہ خوشی سے دیوانی ہو گئی۔

''ارے..... آپ اتنی جلدی!''

عمران نے صحن میں سائیکل کھڑی کی، اتنے میں لبنیٰ اس کے قریب پہنچ گئی۔ اس کے چہرے پر گلاب کھل رہے تھے۔ ان گلابوں کو دیکھ کر عمران کے ہونٹ مچل اُٹھے۔ اس نے لبنیٰ کو بانہوں میں بھر لیا۔

''ارے..... ارے..... کیا کر رہے ہیں۔ پتہ بھی ہے گھر میں کون ہے؟'' لبنیٰ نے بانہوں کے دائرے سے نکلتے ہوئے کہا۔ ''امجد آیا ہے امجد۔''

عمران یہ سن کر اندر ہی اندر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی رگوں میں دوڑتے اچھلتے گرم گرم خون کی بجائے کسی نے برف بھر دی ہو لیکن چہرے سے اس نے اپنی بدلی ہوئی کیفیت کا اندازہ نہ ہونے دیا۔ مسکرا کر کہا۔

''اچھا..... تمہارا بھائی آیا ہے..... تب ہی تو کہوں کہ ایک دن میں تم اتنی موٹی کیسے ہو گئیں۔''

''آپ کو دیکھ کر.....'' لبنیٰ کو کوئی اچھا سا جواب نہ سوجھا تو اس نے یہی کہہ دیا۔ یوں شوہر کو خوش رکھنا بھی ضروری تھا کیونکہ ابھی اس کو میکے جانے کی اجازت بھی لینی تھی۔ لبنیٰ کو کئی مہینے سے گھر جانے کے لئے تڑپ رہی تھی لیکن عمران پیار کی دہائی دے کر اسے روک لیتا۔ اُدھر بھائیوں میں سے کسی کو فرصت نہ تھی کہ خود آ کر لے جاتے۔ لبنیٰ کے کئی خط لکھنے پر امجد بڑی مشکل سے وقت نکال کر آیا تھا اور وہ اب صبح کی گاڑی سے واپس جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

عمران امجد کی آمد سے سمجھ گیا تھا کہ لبنیٰ کا اب رُکنا دشوار ہے۔ اس لئے لبنیٰ نے جب پیار بھری

urdunovelist.blogspot.com

نظروں سے دیکھ کر اجازت مانگی۔ ''امی نے بلایا ہے، اگر آپ کہیں تو چلی جاؤں۔''

تو وہ انکار نہ کر سکا، دل پر پتھر رکھ کر بولا۔

''چلی جاؤ بھائی..... لیکن میکے میں جم کر نہ بیٹھ جانا، ورنہ تمہاری چہیتی کا برا حال ہو جائے گا۔''

''ناصرہ کو چھوڑیں، آپ اپنی بات کریں اپنی!''

''ارے ہم تو گزار ہی لیں گے کسی نہ کسی طرح..... پر اُس بیچاری کا کیا ہوگا جو اپنی بہنوں سے زیادہ تمہیں چاہتی ہے..... وہ دیوانی ہے کہاں آج۔ آئی نہیں؟''

''آئی کیوں نہیں، ابھی گھنٹہ بھر پہلے ہی تو گئی ہے، اسکول کا وقت جو ہو گیا۔''

''بھئی ہے بڑی باتونی۔ بالکل عورتوں کی طرح باتیں کرتی ہے۔ اب تمہاری غیر موجودگی میں میرے کان کھایا کرے گی۔ چلو اسے بھی بھگتیں گے۔''

صبح چھ بجے کی گاڑی سے وہ دونوں چلے گئے۔ عمران نے اسٹیشن جانے کے لئے کہا بھی، تو دونوں نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ ایسی برف بنانے والی سردی میں وہ اسٹیشن نہ جائے اور وہ فوراً مان گیا تھا۔

ابھی وہ سو ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ عمران کی نیند ٹوٹ گئی۔ لبنیٰ اپنے میکے جا چکی تھی۔ وہی اس کو اس طرح جگاتی تھی۔ یہ کون ہے!..... عمران نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر پھیرا، تو وہ کسی بچی کا ہاتھ لگا۔ عمران کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ''اچھا..... تو آپ ہیں!''

''یہ آپ کے سونے کا وقت ہے؟'' ناصرہ نے مصنوعی غصہ دکھایا۔

''تم ابھی نہ آتیں، تو میں کچھ دیر اور سوتا..... لیکن تم گھر میں کس طرح آ گئیں؟''

''دروازے سے..... جناب دروازہ چوپٹ کھلا پڑا تھا۔ اگر کوئی چور گھر میں گھس آتا تو سارا صفایا کر جاتا اور آپ مزے سے خراٹے بھرتے رہتے۔''

''ناصرہ!..... کلرک کے گھر سے چور کیا لے جاتا۔''

''صحن میں کھڑی سائیکل ہی لے کر چلتا بنتا تو؟'' وہ ہار ماننے والی کہاں تھی۔

''تو کیا!..... ہم پاؤں پاؤں دفتر جاتے اور کیا ہوتا۔''

''باجی گئیں؟''

''میرا خیال ہے کہ چلی گئیں۔''

''اچھا، اب آپ باتیں ہی بناتے رہیں گے یا اُٹھیں گے بھی!..... ابھی آپ کو شیو بھی بنانا ہے۔''

''تمہیں کیسے معلوم کہ مجھے شیو بنانا ہے؟''

''کیوں؟..... چہرے پر مجھے گھاس اُگی ہوئی دکھائی نہیں دے رہی کیا؟''

''ناصرہ.....! تمہاری عمر کیا ہوگی؟''

''بارہ سال!..... ویسے لڑکیوں سے ان کی عمر نہیں پوچھی جاتی۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''تم ہو تو بارہ برس کی..... لیکن تمہاری باتیں.....؟''

''تو دادی اماں جیسی ہیں..... ہاں ہاں، کہہ دیجئے رُک کیوں گئے..... امی بھی یہی کہا کرتی ہیں۔''

''تو کون سا غلط کہتی ہیں.....!'' عمران نے ہونٹوں ہونٹوں میں کہا اس طرح کہ وہ سمجھ نہ پائی۔

''کیا کہا.....؟'' ناصرہ نے آنکھیں نکالیں۔

''کچھ نہیں بھئی!'' عمران نے اُٹھنے میں ہی عافیت جانی..... وہ اُٹھا تو ناصرہ نے چپل سیدھے کر کے اس کے سامنے رکھ دیئے۔ چپل پہن کر وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ کچھ دیر بعد باہر آیا، تو اس نے دیکھا کہ میز پر شیو کا سامان سجا ہوا ہے اور ناصرہ غائب ہے۔

وہ سوچنے لگا کہ اس بچی کو بڑا بننے کا کتنا شوق ہے۔ یہ شعوری طور پر لبنیٰ کا کردار نباہنے کی کوشش کر رہی ہے اور بڑی حد تک نباہ بھی رہی ہے۔ لبنیٰ بھی تو میرا اسی طرح خیال رکھتی ہے۔ اُسے کبھی کچھ زبان سے کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ سب کچھ خود بخود ہو جاتا ہے۔ لبنیٰ جیسی بیویاں ہر ایک کو کہاں ملتی ہیں۔ میں واقعی خوش نصیب ہوں۔

''ارے ننھی گڑیا.....! کہاں ہو.....؟''

''میں اِدھر ہوں عمران بھائی جان!..... باورچی خانے میں۔''

عمران بھائی جان!..... یہ تو مجھے ہمیشہ دولہا بھائی کہا کرتی ہے۔ آج میں عمران بھائی جان ہو گیا۔ آخر کیوں؟ پھر اُسے خیال آیا کہ لبنیٰ بھی اس کا نام لیتی ہے۔ اس لئے یہ کیوں پیچھے رہے۔

urdunovelist.blogspot.com

''آپ شیو بنا کر نہائیں گے یا صرف منہ دھوئیں گے؟''..... باورچی خانے سے آواز آئی۔

''میں نہاؤں گا بھئی۔''

''عمران بھائی جان!..... بہت سردی ہے۔ نہائیں نہ تو اچھا ہے۔ پر آپ مانیں گے تھوڑے ہی، روز نہانے کی عادت جو ہے۔ اچھا میں پانی گرم کرنے کے لئے رکھ رہی ہوں۔''

''شکریہ! ننھی گڑیا.....'' عمران نے گنگناتی آواز میں کہا۔

''میرا نام ناصرہ ہے ناصرہ!'' باورچی خانے میں شیشے کا گلاس چھن سے ٹوٹ گیا۔

عمران چونک پڑا..... اس نے ننھی گڑیا کہہ کر اس کے بڑے پن کو ٹھیس پہنچائی تھی۔

''شکریہ..... ناصرہ ڈیئر!''

باورچی خانے سے ہنسی کی آواز سنائی دی۔ عمران پچھتانے لگا کہ اس نے اسے ڈیئر کیوں کہا۔ یہ لفظ تو اس نے صرف لبنیٰ کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ وہ جلدی جلدی بال کھرچنے لگا تاکہ احساس کی شدت کم ہو جائے۔

''عمران بھائی جان!..... کیا بجا ہے؟''

آتش دان پر رکھی گھڑی پر عمران نے نظر ڈالی، تو ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اس نے ٹائم بتایا۔

''ساڑھے نو بجے ہیں۔''

''آپ کا شیو بن گیا؟''

''بس بن گیا سمجھو؟''

''ہائے اللہ! جلدی کیجئے..... ناشتے کو دیر ہو رہی ہے نا!''

''ناصرہ، تم آج اسکول نہیں گئیں؟''

''میرا اسکول دوسری شفٹ میں لگتا ہے۔ ساڑھے بارہ بجے جاؤں گی..... آپ آج آفس جائیں گے؟''

''ہاں بھئی جانا تو ہے..... پر پہنچ جائیں گے اطمینان سے!''

عمران شیو کر کے اُٹھا، تو ناصرہ گرم پانی غسل خانے میں رکھ چکی تھی۔

''جائیے..... جلدی سے نہا کر آئیے!'' وہ بڑے انداز سے بولی۔

''بہت بہتر، ناصرہ خانم!''..... عمران نے بڑے مؤدبانہ لہجے میں کہا، تو ناصرہ ہونٹوں ہی ہونٹوں مسکرا کر رہ گئی۔

خوب ہے یہ بچی بھی۔ کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ وہ نہاتا رہا، اور ناصرہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ لبنیٰ سے اس کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ لبنیٰ بھی تو بالکل اپنی بہنوں کی طرح پیار کرتی تھی۔ کہیں جائے تو ناصرہ ساتھ، کچھ پکائے تو خود کھائے نہ کھائے ناصرہ ضرور کھائے گی، لبنیٰ چونکہ گھر میں اکیلی رہتی تھی اس لئے ناصرہ کی وجہ سے اس کا دل لگا رہتا تھا۔ ناصرہ خدانخواستہ بیمار ہو جاتی تو لبنیٰ بے کل سی پھرتی۔ اُس کے گھر چلی جاتی۔ اس کی تیمارداری کرتی، اُسے جلدی سے اچھا کر کے گھر لے آتی۔ ناصرہ کی امی اکثر کہا کرتیں.....

''بھئی لبنیٰ!..... ناصرہ کو تو تم اپنے گھر ہی رکھ لو۔ نہ اس کا دل تمہارے بغیر لگتا ہے اور نہ تمہارا۔''

لبنیٰ کو اس کی باتوں میں بڑا مزہ آتا تھا۔ یہ باتیں بھی تو ایسی ہی کرتی ہے۔ اپنی باتوں سے بچی تو معلوم ہی نہیں ہوتی۔ بارہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے، جسم ننھے پودے کی طرح ہوتا ہے۔ پھول پھل سے خالی۔ نہ کہیں پہاڑ، نہ کہیں گھاٹیاں۔ بالکل چٹیل میدان۔ پھر یہی چٹیل میدان چند سالوں میں ایسی کروٹیں بدلتا ہے کہ آنکھیں دیکھتی ہی رہ جاتی ہیں۔ یہ لڑکیاں جوان ہونے میں اپنا سارا ہی زور صرف کر دیتی ہیں۔

غسل خانے سے نکل کر ابھی وہ بال ہی بنا رہا تھا کہ چھوٹی سی ناصرہ بڑی سی ناشتے کی ٹرے لئے ہوئے چلی آئی۔ ٹرے میں پراٹھے تھے جو لبنیٰ بنا کر رکھ گئی تھی اس کے علاوہ آملیٹ اور چائے، جو ناصرہ نے تیار کئے تھے۔

''ارے واہ، واہ..... تم تو بڑے کام کی لڑکی ہو.....'' یہ کہہ کر عمران نے ناصرہ کے مالٹے سے گال پر چٹکی بھری۔

''ہائے اللہ!''

وہ کچھ اس طرح شرمائی کہ اسے بے اختیار لبنیٰ یاد آ گئی۔ عمران نے مسکرا کر اُسے دیکھا، تو وہ اور اپنے اندر سمٹ گئی۔ دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے بولی۔ ''میں ابھی آتی ہوں..... ذرا امی کو شکل دکھا آؤں۔''

urdunovelist.blogspot.com

ناشتہ کرنے کے بعد پہلی بار عمران کو احساس ہوا کہ وہ گھر میں اکیلا ہے اور نہ جانے کب تک اکیلا رہنا ہے۔ دن کی تو خیر کوئی بات نہیں۔ دفتر اور دوستوں میں کٹ جائے گا۔ پر یہ مہاوٹ کی راتیں تنہا کیسے بیتیں گی۔ یوں تو عمران نے لبنیٰ سے کئی دنوں کا حساب بے باق کرلیا تھا، پھر بھی تنہائی اسے کھانے کو دوڑے گی..... پھر اسے لبنیٰ پر غصہ آنے لگا، فضول ہی میکے چل گئی۔ ان بیویوں کو کتنا ہی پیار کرو، گلے کا ہار بناؤ، پھر بھی میکہ ان کے ذہن سے محو نہیں ہوتا۔ حکومت کو چاہئے کہ بیویوں کے میکے جانے پر پابندی لگا دے۔ اس خیال پر اُسے خود ہی ہنسی آ گئی۔ بڑی بوڑھیاں کہتی ہیں کہ شوہر بیوی کی محبت برقرار رکھنے کے لئے میکہ بڑا اہم رول ادا کرتا ہے..... کرتا ہوگا!

اس نے ناشتے کی ٹرے اُٹھائی۔ باورچی خانے میں ڈالی۔ گھی میں سنی ہوئی انگلیوں کو تولیے سے پونچھا اور پھر منہ صاف کر کے تولیہ تار پر پھیلا دیا۔ دروازہ کھلا۔ ناصرہ اندر داخل ہوئی۔ کواڑ بند کر کے اس نے کنڈی چڑھا دی۔ پھر عمران کی طرف پلٹی..... عمران نے ناصرہ میں واضح تبدیلی محسوس کی۔

یہ اب سے چند گھنٹے پہلے کی ناصرہ ہرگز نہ تھی۔ کوئی کلی پھول بننے کی کوشش میں تھی۔

''یہ آپ نے کنڈی کس خوشی میں بند کر دی؟''

''مرغیاں گھر میں گھس آئیں گی، خواہ مخواہ صحن گندا ہوگا..... صاف تو مجھے ہی کرنا پڑے گا۔''

''امی کو شکل دکھا آئیں؟''

''ہاں!.....'' اس نے گردن میں خم دے کر کہا۔

''امی نے شکل دیکھ کر کیا کہا؟..... کہا ہوگا، ہائے ناصرہ! بڑی پیاری لگ رہی ہو!''

''چلئے ہٹئے بھی!''..... ناصرہ کانوں تک سرخ ہوگئی۔

عمران نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تو اس نے محسوس کیا کہ ناصرہ منہ دھو کر، ہونٹوں اور گالوں پر ہلکی ہلکی سرخی اور بال سنوار کر آئی ہے۔ یہ میک اپ کس لئے؟

''امی نے کہا ہے کہ اپنے دولہا بھائی سے کہنا کہ وہ کھانا ہوٹل میں کھانے کے بجائے ہمارے گھر کھائیں۔''

''ارے نہیں ناصرہ!..... امی سے میرا شکریہ ادا کرنا، اُن سے کہنا کہ میرا کچھ ٹھیک نہیں ہے کب گھر واپس لوٹوں، انہیں خواہ مخواہ زحمت ہوگی۔''

''تو آپ کھانا ہوٹل میں کھائیں گے؟''..... ناصرہ نے بڑی بڑی آنکھوں سے اُسے گھورا۔

''ہاں!''

''جائیے میں آپ سے نہیں بولتی۔''

یہ کہہ کر وہ پلنگ پر دھم سے گر پڑی اور گڑی مڑی ہو کر لیٹ گئی۔

''بھئی ناصرہ تو ناراض ہوگئی، اچھا بھئی کھانا تمہارے گھر ہی کھا لیں گے..... اب تو خوش ہو جاؤ!''

لیکن ناصرہ جوں کی توں لیٹی رہی۔ بس ذرا سا کسمسائی۔

عمران آہستہ آہستہ پلنگ کی طرف بڑھا۔ ناصرہ پلنگ پر عجیب انداز سے لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا منہ ہاتھوں سے چھپا رکھا تھا، لگ رہا تھا جیسے پلنگ پر گاؤ تکیہ رکھا ہو..... کوئی آئے اور کمر لگا کر بیٹھ جائے۔

یکا یک عمران کے ذہن میں کئی سال پہلے کا واقعہ بجلی کی مانند کوند گیا..... ایک دن ایسے ہی، اکیلے گھر میں یاسمین (پڑوسن) بھی تو بلاوجہ کی بات پر روٹھ کر اسی طرح گاؤ تکیہ بن کر لیٹ گئی تھی۔ عمران نے لاکھ منانے کی کوشش کی، حتیٰ کہ معافی بھی مانگی لیکن وہ چپ چاپ یونہی مسہری پر لیٹی رہی تھی اور جب عمران نے مسہری پر بیٹھ کر یاسمین کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تو یاسمین گھٹا کی طرح اس پر چھا گئی تھی..... عورت بستر کی بات اشاروں میں کرتی ہے، منہ پھاڑ کر کب بولتی ہے!

''ناصرہ! چھوڑو بھئی غصہ..... میں نے کہہ تو دیا کہ کھالوں گا کھانا.....'' عمران نے کہا۔ ابھی وہ پلنگ پر نہیں بیٹھا تھا اور نہ ہی اس نے ناصرہ کے جسم کو چھوا تھا۔

ناصرہ نے ہاتھوں سے چہرہ نکالا۔ پھر سرخ سرخ ڈورے والی نگاہوں سے اسے دیکھا اور چہرہ تکیے میں چھپا لیا۔

ناصرہ ہانپ رہی تھی۔

عمران جھکا۔ اس نے اپنے ٹھنڈے ہاتھوں سے ناصرہ کے رخساروں کو چھوا۔ ناصرہ گرم لوہے کی طرح لال ہو رہی تھی۔ وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ پھر اس کے ہونٹ بڑھنے لگے..... ناک، آنکھ، اس سے بھی آگے کانوں کی طرف۔ عمران نے اس کے کان کی لو کو اپنے ہونٹوں سے چھوا۔ اور

urdunovelist.blogspot.com

آہستہ سے بولا۔

''میری جان ابھی نہیں.....ابھی تم چھوٹی ہو!''

پھر وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ گیا۔ ناصرہ سسکتی رہ گئی۔

عمران کرسی پر دیوار کی طرح گرا۔ اسے کہیں سے کچے کوئلے کے دھویں کی بو آ رہی تھی۔ جیسے اس کا اپنا وجود اندر سے جلنے لگا ہو۔ اس نے اخبار اُٹھالیا اور پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

ناصرہ اُٹھی، اور یوں چلی جیسے کانٹوں پر چل رہی ہو۔ اس کی چال میں ایک مکمل عورت کی جھلک تھی، ایک شکست خوردہ عورت کی۔ وہ احساس کی چبھن سے لہولہان ہوتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

دروازے کی دہلیز پر پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لئے رکی۔ گردن موڑ کر عمران کی طرف دیکھا.....عمران اپنا چہرہ اخبار میں چھپائے ہوئے تھا۔

عمران نے جب گھر کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی تو وہ اخبار پھینک کر دروازے تک گیا۔

اور دروازے کی کنڈی اس طرح لگادی جیسے ناصرہ کیلئے یہ دروازہ ہمیشہ کیلئے بند کر دیا ہو۔

□□

urdunovelist.blogspot.com